سوشل سائنس

ہمارا ماضی – III

آٹھویں جماعت کے لیے
تاریخ کی درسی کتاب

نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ
NATIONAL COUNCIL OF EDUCATIONAL RESEARCH AND TRAINING

2019-20

Hamara Maazi-III, (Our Past-III),
Textbook in Urdu for Class-VIII

ISBN 978-93-5292-130-0

پہلا اُردو ایڈیشن

نومبر 2008 اگہن 1930

دیگر طباعت

فروری 2014 ، مئی 2015 اور جولائی 2018

ترمیم شدہ طباعت

اپریل 2019 چیتر 1941

PD 2T SPA

این سی ای آر ٹی کے پبلی کیشن ڈویژن کے دفاتر

این سی ای آر ٹی کیمپس
سری اروندو مارگ
نئی دہلی - 110016 فون 011-26562708

108,100 فٹ روڈ ہوسڈے کیرے ہیلی
ایکسٹینشن بناشنکری III اسٹیج
بنگلورو - 560085 فون 080-26725740

نوجیون ٹرسٹ بھون
ڈاک گھر، نوجیون
احمد آباد - 380014 فون 079-27541446

سی ڈبلیو سی کیمپس
بمقابل ڈھانکل بس اسٹاپ، پانی ہاٹی
کولکاتا - 700114 فون 033-25530454

سی ڈبلیو سی کامپلیکس
مالی گاؤں
گواہاٹی - 781021 فون 0361-2674869

قیمت : ₹ ??.00

اشاعتی ٹیم

ہیڈ، پبلی کیشن ڈویژن : محمد سراج انور
چیف ایڈیٹر : شویتا اُپّل
چیف پروڈکشن آفیسر : ارون چتکارا
چیف بزنس منیجر : ابیناش کُلّو
ایڈیٹر : سید پرویز احمد
پروڈکشن اسسٹنٹ : عبدالنعیم

سرورق اور لے آؤٹ
آرٹ کریشنز

کارٹوگرافی
کارٹو گرافی ڈیزائن ایجنسی

این سی ای آر ٹی واٹر مارک 80 جی ایس ایم کاغذ پر شائع شدہ

سکریٹری، نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ، شری اروندو مارگ، نئی دہلی نے

میں

چھپوا کر پبلی کیشن ڈویژن سے شائع کیا۔

پیش لفظ

’قومی درسیات کا خاکہ — 2005‘ میں سفارش کی گئی ہے کہ بچوں کی اسکول کی زندگی، ان کی باہر کی زندگی سے ہم آہنگ ہونی چاہیے۔ یہ زاویۂ نظر، کتابی علم کی اس روایت کی نفی کرتا ہے جس کے باعث آج تک ہمارے نظام میں گھر اور سماج کے درمیان فاصلے حائل ہیں۔ نئے قومی درسیات کے خاکے پر مبنی نصاب اور درسی کتابیں اسی بنیادی خیال پر عمل آوری کی ایک کوشش ہے۔ اس کوشش میں مختلف مضامین کو ایک دوسرے سے الگ رکھنے اور رٹ کر پڑھنے کے طریقۂ کار کی حوصلہ شکنی بھی شامل ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ان اقدامات سے قومی تعلیمی پالیسی 1986 میں مذکور ’تعلیم کے طفل مرکوز نظام‘ کی طرف مزید پیش رفت ہوگی۔

اس کوشش کی کامیابی کا انحصار اس پر ہے کہ اسکولوں کے پرنسپل اور اساتذہ بچوں میں اپنے تاثرات خود ظاہر کرنے اور ذہنی سرگرمیوں اور سوالوں کے ذریعے سیکھنے کی ہمّت افزائی کریں۔ ہمیں یہ ضرور تسلیم کرنا چاہیے کہ بچوں کو اگر موقع، وقت اور آزادی دی جائے تو وہ بڑوں سے حاصل شدہ معلومات سے وابستہ ہوکر، نئی معلومات مرتب کرتے ہیں۔ آموزش کے دوسرے ذرائع اور محل وقوع کو نظر انداز کرنے کے بنیادی اسباب میں سے ایک اہم سبب مجوزہ درسی کتاب کو امتحان کے لیے واحد ذریعہ بنانا ہے۔ بچّوں کے اندر تخلیقی صلاحیت اور پیش قدمی کے رجحان کو فروغ دینا اسی وقت ممکن ہے جب ہم آموزشی عمل میں بچّوں کو بحیثیت شریک کار قبول کریں اور اُن سے اسی طرح پیش آئیں۔ انھیں محض مقررہ معلومات کا پابند نہ سمجھیں۔

یہ مقاصد اسکول کے معمولات اور طریقۂ کار میں معقول تبدیلی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ روزمرہ نظام الاوقات (Time-Table) میں لچیلا پن اُسی قدر ضروری ہے جتنی کہ سالانہ کیلنڈر کے نفاذ میں سخت محنت کی تاکہ مطلوبہ ایّام کو حقیقتاً تدریس کے لیے وقف کیا جاسکے۔ تدریس اور اندازۂ قدر کے طریقوں سے بھی اس امر کا تعین ہوگا کہ یہ درسی کتاب، بچوں میں ذہنی تناؤ اور اکتاہٹ کا ذریعہ بننے کے بجائے ان کی اسکولی زندگی کو خوش گوار بنانے میں کس حد تک مؤثر ثابت ہوتی ہے۔ نصابی بوجھ کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے نصاب سازوں نے مختلف سطحوں پر معلومات کی تشکیلِ نو اور اسے نیا رخ دینے کی غرض سے بچوں کی نفسیات اور تدریس کے لیے دستیاب وقت پر زیادہ سنجیدگی کے ساتھ توجہ دی ہے۔ اس مخلصانہ کوشش کو مزید

بہتر بنانے کے لیے یہ درسی کتاب سوچنے اور محسوس کرنے کی تربیت، چھوٹے گروپوں میں بحث ومباحثہ کرنے اور عملاً انجام دی جانے والی سرگرمیوں کو زیادہ اولیت دیتی ہے۔

این سی ای آر ٹی اس کتاب کے لیے تشکیل دی جانے والی ''کمیٹی برائے درسی کتاب'' کی مخلصانہ کوششوں کی شکر گزار ہے۔ کونسل سماجی علوم کی درسی کتب کی مشاورتی کمیٹی کے چیئر پرسن پروفیسر ہری واسودیون اور اس کتاب کی خصوصی صلاح کار وبھا پارتھا سارتھی کی ممنون ہے۔ اس درسی کتاب کی تیاری میں جن اساتذہ نے حصّہ لیا، ہم ان کے متعلقہ اداروں کے بھی شکر گزار ہیں۔ ہم ان سب ہی اداروں اور تنظیموں کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے اپنے وسائل، مآخذ اور عملے کی فراہمی میں فراخ دلی کا ثبوت دیا۔ ہم وزارت برائے فروغ انسانی وسائل، حکومت ہند کے شعبہ برائے ثانوی اور اعلیٰ ثانوی تعلیم کی جانب سے پروفیسر مرنال مری اور پروفیسر جی۔ پی۔ دیش پانڈے کی سربراہی میں تشکیل شدہ نگراں کمیٹی (مانیٹرنگ کمیٹی) کے اراکین کا بھی خصوصی شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے اپنا قیمتی وقت اور تعاون ہمیں دیا۔ کونسل اس کتاب کے اردو ترجمے کے لیے محمد حسن فاروقی کی شکر گزار ہے۔ باضابطہ اصلاح اور اپنی اشاعت کے معیار کو مسلسل بہتر بنانے کے مقصد کی پابند ایک تنظیم کے طور پر این سی ای آر ٹی تمام مشوروں اور آرا کا خیر مقدم کرتی ہے تاکہ کتاب کو مزید غور وفکر کے بعد اور زیادہ کارآمد اور بامعنی بنایا جاسکے۔

نئی دہلی — ڈائریکٹر

30 نومبر 2007 — نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ

کمیٹی برائے درسی کتب

چیئر پرسن، مشاورتی کمیٹی برائے سوشل سائنس کی درسی کتب

ہری واسودیون، پروفیسر، شعبۂ تاریخ، کلکتہ یونیورسٹی، کولکاتا

صلاح کار

نیلادری بھٹاچاریہ، پروفیسر، سینٹر فار دی ہسٹوریکل اسٹڈیز، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

اراکین

انیل سیٹھی، پروفیسر، ڈی ای ایس ایس ایچ، این سی ای آر ٹی، نئی دہلی

انجلی کھلّر، پی جی ٹی (تاریخ) کیمبرج اسکول، نئی دہلی

ارچنا پرساد، ریڈر، سینٹر فار جواہر لعل نہرو اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

جانکی نائر، پروفیسر، سینٹر فار اسٹڈیز ان سوشل سائنسز، کولکاتا

پروبھو مہاپاترا، ریڈر، دہلی یونیورسٹی، دہلی

رام چندر گوہا، آزاد ادیب، ماہر انتھیر وپولوا ور مورخ، بنگلور

رشمی پالیوال، ایکلویہ، ہوشنگ آباد، مدھیہ پردیش

سنجے شرما، ریڈر، ذاکر حسین کالج، دہلی یونیورسٹی، نئی دہلی

ستوندر کور، پی جی ٹی (تاریخ)، کیندریہ ودیالیہ نمبر I، جالندھر، پنجاب

سراج انور، پروفیسر و ہیڈ، پی پی ایم ای ڈی، این سی ای آر ٹی، نئی دہلی

سمیتا سہائے بھٹاچاریہ، پی جی ٹی (تاریخ)، بلیو بیلس اسکول، نئی دہلی

تانیکا سرکار، پروفیسر، سینٹر فار ہسٹوریکل اسٹڈیز، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

تاپتی گوہا-ٹھاکرتا، پروفیسر، سینٹر فار اسٹڈیز ان سوشل سائنسز، کولکاتا

ممبر کوآرڈی نیٹر

ریتو سنگھ، لکچرر، ڈپارٹمنٹ آف ایجوکیشن ان سوشل سائنسز، این سی ای آر ٹی، نئی دہلی

اردو ترجمہ

محمد حسن فاروقی، ریٹائرڈ پرنسپل، جمہور ہائر سکنڈری اسکول، مالیگاؤں

پروگرام کوآرڈی نیٹر (اردو ترجمہ)

فاروق انصاری، پروفیسر، ڈپارٹمنٹ آف لینگویجز، این سی ای آر ٹی، نئی دہلی

اشکال اور نقشوں کے لیے اظہار تشکر

شخصی

سنیل جناح (باب 4 اشکال 4، 8، 9، 10)

ادارے

دی القاضی فاؤنڈیشن فار دی آرٹس (باب 5 شکل 11، باب 6 اشکال 3، 7)

وکٹوریا میموریل میوزیم (سبق 5 شکل 1)

کتب

اینڈر یز وولوہنسن، امپریل دھلی: دی برٹش کیپٹل آف دی انڈین ایمپائر (باب 1 شکل 4؛ سبق 6 اشکال 9، 10، 16)

بیلی، سی۔ اے (مرتب)، این السٹریڈ ھسٹری آف ماڈرن انڈیا 1947 - 1600 (باب 1 شکل 1؛ باب 2 اشکال 5، 12؛ باب 3 شکل 1)

کولس ورتھی گرانٹ، رورل لائف ان بنگال (باب 3 اشکال 18، 9، 11، 12، 13)

کولن کیمپبل، نیٹو آف دی انڈین ریوولٹ فرام اٹس آئوٹ بریک ٹو دی کیپچر آف لکھنئو (باب 5 اشکال 3، 5، 6، 7، 8)

گوتم بھدررا، فرام این امپیریل پروڈکٹ ٹو اے نیشنل ڈرنک: دی کلچر آف ٹی کنزمیشن ان ماڈرن انڈیا (باب 1 شکل 2)

ماتھیو، ایچ، ایڈنی، میپنگ این ایمپائر: دی جغرافیکل کنسٹرکشن آف برٹش انڈیا، 1765-1843 (باب 1 شکل 1)

نورما ایونیسن، دی انڈین میٹروپولس؛ اے ویو ٹو ورڈ دی ویسٹ (باب 6 اشکال 8، 13، 14، 15)

آر۔ ایچ۔ فلیمور، ھسٹوریکل ریکارڈز آف دی سروے آف انڈیا (باب 1 شکل 6)

رابرٹ مونٹگومیری مارٹین، دی انڈین ایمپائر (باب 1 شکل 7؛ باب 2 شکل 1؛ باب 5 اشکال 7، 9)

رودرانگشومکھرجی اور پرمود کپور، ڈیٹلائین - 1857: ریوولٹ اگینسٹ دی راج
(باب 5 اشکال2، 7)

سوسان ایس۔ بین،یانکی انڈیا: امریکن کمریشیل اینڈ کلچرل انکائونٹرس ود انڈیا ان دی ایج آف سیل ، 1784-1860 **(باب 2 شکل8؛ باب 3 شکل2)**

سوسن اسٹرانگ (مرتب، دی آر ٹ آف دی سکھ کنگ ڈم **(باب 2 شکل11)**

ٹیزیانا اینڈ گینی بالڈیزون ہزن،ہیڈن ٹرائبس آف انڈیا **(باب 4 اشکال1، 2، 5، 6، 7)**

اظہار تشکر

یہ درسی کتاب مورخین، ماہرین تعلیم اور اساتذہ کی مجموعی کاوشات کا حاصل ہے۔ اس کتاب کے تمام اسباق کئی ماہ کی محنت اور ترمیم و اضافہ کے بعد ترتیب دیے گئے ہیں۔ اس عمل میں متعدد ورکشاپ میں بحث و مباحثہ اور تبادلہ خیالات کے علاوہ ای میل اور ہر ممبر کے ذاتی تجربات شامل ہیں۔ اس پورے عمل میں ہمیں بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔

بہت سارے لوگوں اور اداروں نے اس کتاب کی تیاری میں معاونت کی۔ پروفیسر مظفر عالم اور ڈاکٹر کم کم رائے نے مسودے کو بغور دیکھا اور اپنے بیش قیمت مشوروں سے نوازا۔ کئی اداروں نے اپنی ذخائر میں سے تصاویر کے عکس فراہم کیے۔ دہلی شہر اور 1857 کے واقعات کی کئی تصاویر القاضی فاؤنڈیشن نے ہمیں فراہم کیں۔ برٹش راج سے متعلق انیسویں صدی کی کئی باتصویر کتابیں انڈیا انٹرنیشنل سینٹر کے انڈیا کلکشن سے حاصل کی گئی ہیں۔ ہمیں بے حد خوشی ہے کہ سنیل جناح جن کی عمر اب 90 سال کی ہوچکی ہے، نے اپنی تصاویر کو شامل کرنے کی اجازت دی۔ انھوں نے چوتھی دہائی کے اوائل سے قبائلی علاقوں پر تحقیق اور مختلف فرقوں کی روزمرہ زندگی کو کیمرے میں قید کیا ہے۔ ان میں سے بعض تصاویر (دی ٹرائبل انڈیا، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، 2003) شائع ہوچکی ہیں اور بہت ساری اندرا گاندھی نیشنل سینٹر فار آرٹس میں رکھی گئی ہیں۔

شالنی اڈوانی اور شیاما وارنر نے کئی مرتبہ اس کتاب کی ایڈیٹنگ کی اور مسودے کو خوب سے خوب تر بنانے میں ہماری مدد کی، ہم ان کے بے حد ممنون ہیں۔

اس کتاب کو اردو قالب میں ڈھالنے کی کوشش جناب محمد حسن فاروقی نے کی ہے۔ کونسل ان کی اس کوشش کے لیے شکر گزار ہے۔

کونسل اس کتاب کے اردو مسودے کی ویٹنگ کے لیے منعقد کی گئی ورکشاپ کے شرکا پروفیسر شاہد حسین، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی؛ ڈاکٹر شہپر رسول، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی؛ ڈاکٹر یعقوب یاور، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی؛ جناب سلیم شہزاد، مالیگاؤں؛ پروفیسر انیل سیٹھی اور ڈاکٹر ریتو سنگھ، ڈی ای ایس ایس ایچ، این سی ای آر ٹی، نئی دہلی؛ پروفیسر نعمان خاں، ڈاکٹر فاروق انصاری اور ڈاکٹر چمن آرا خاں، ڈپارٹمنٹ آف لینگویجز، این سی ای آر ٹی، نئی دہلی کے بیش قیمت مشوروں کے لیے بے حد ممنون ہے۔

اس کتاب کی تیاری کے لیے کونسل کاپی ایڈیٹر ابو امام منیر الدین اور صدر الدین، پروف ریڈرس عظیم الدین صدیقی اور محمد اکبر، ڈی ٹی پی آپریٹر شمائلہ فاطمہ، ابوالحسن اور صائمہ اور کمپیوٹر اسٹیشن انچارج پرش رام کی بے حد ممنون ہے۔

بھارت کا آئین

تمہید

ہَم بھارت کے عوام متانت وسنجیدگی سے عزم کرتے ہیں کہ بھارَت کو ایک مقتَدر، سمَاج وَادی، غیر مَذہَبی عوامی جمہُوریَہ بنائیں اور اس کے تمام شہریوں کے لیے حاصل کریں۔

انصاف سماجی، معاشی اور سیاسی

آزادی خیال، اظہار، عقیدہ، دین اور عبادت

مساوات بہ اعتبار حیثیت اور موقع اور ان سب میں

اخوت کو ترقی دیں جس سے فرد کی عظمت اور قوم کے اتحاد اور سالمیت کا تیقن ہو۔

اپنی آئین ساز اسمبلی میں آج چھبیس نومبر 1949ء کو یہ آئین ذریعہ ہذا اختیار کرتے ہیں، وضع کرتے ہیں اور اپنے آپ پر نافذ کرتے ہیں۔

1۔ آئینی (بیالیسویں ترمیم) ایکٹ، 1976 کے سیکشن 2 کے ذریعہ ''مقتدر عوامی جمہوریہ'' کی جگہ (3-1-1977 سے)

2۔ آئینی (بیالیسویں ترمیم) ایکٹ، 1976 کے سیکشن 2 کے ذریعہ ''قوم کے اتحاد'' کی جگہ (3-1-1977 سے)

فہرست

برٹش ریذیڈنٹ پونہ کے دربار میں معاہدے پر دستخط کرتے ہوئے، 1790

1 کیسے، کب اور کہاں

تاریخیں (Dates) کتنی اہم ہیں؟

ایک وقت تھا کہ مؤرخین پر تاریخوں کا جادو چھایا ہوا تھا۔ لوگوں کے درمیان بحثیں ہوا کرتی تھیں کہ حکمرانوں کی تاج پوشی کب ہوئی یا جنگیں کن تاریخوں میں لڑی گئیں؟ عوامی زبان میں تاریخ (History) کا علم تاریخوں ہی کا مترادف تھا۔ آپ نے لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا ہوگا کہ ''تاریخ انتہائی اکتا دینے والا علم ہے تاریخ صرف تاریخوں کے یاد کر لینے کا نام ہے۔'' کیا ایسا سوچنا مناسب ہے؟

تاریخ کا علم یقیناً زمانے کے ساتھ ساتھ ہونے والی تبدیلیوں سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ چیزیں ماضی میں کیسی تھیں اور ان میں کیا تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ گزرے ہوئے زمانے کا جب ہم موجودہ حالات سے موازنہ کرتے ہیں تو ہماری زبان پر ''پہلے'' اور ''بعد'' کے الفاظ آ جاتے ہیں۔

روزمرہ کی زندگی میں ہم اپنے اطراف کے بارے میں کوئی تاریخی سوال نہیں کرتے۔ ہم انھیں جوں کا توں قبول کر لیتے ہیں گویا جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں ہمیشہ سے دنیا میں ایسے ہی موجود رہا ہو۔ لیکن حیرت اس وقت ہوتی ہے جب ہم اچانک ایسے سوالات کر بیٹھتے ہیں جو واقعتاً تاریخ سے متعلق ہوتے ہیں۔ سڑک کے کنارے چائے خانے میں کسی

سرگرمی

شکل 1 کو غور سے دیکھیے اور ایک پیراگراف اس بابت لکھیے کہ تصویر شاہی مزاج کو کس طرح نمایاں کرتی ہے۔

HINDOOSTAN
By J. Rennell F.R.S. 1782.

شکل 1- برہمن اپنے شاستروں کو برطانیہ کے ایجنٹوں کے حوالے کرتے ہوئے، جیمس رینل کے ذریعے 1782 میں بنائے گئے ہندوستان کے نقشے کا سرنامہ

رابرٹ کلائیو نے رینل کو ہندوستان کا نقشہ بنانے کے لیے کہا تھا جس پر اس نے ہندوستان پر برطانیہ کے فاتح ہونے کی پرجوش حمایت کے جذبہ کے ساتھ عمل کیا۔ رینل سامراج کے استحکام کے لیے اسے ضروری سمجھتا تھا۔ تصویر بالا یہ بتاتی ہے کہ اپنی مقدس کتابوں کو بخوشی برطانوی حکومت کے حوالے کرنے کا مطلب یہ تھا کہ برطانیہ ہی ہندوستانی ثقافت کا محافظ ہے۔

شخص کو چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے دیکھ کر آپ کے ذہن میں سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ لوگوں نے کب سے چائے یا کافی پینی شروع کی؟ سفر میں ٹرین کی کھڑکی سے جھانکتے ہوئے آپ خود یہ سوال کر سکتے ہیں کہ ریلیں کب بنائی گئیں اور ریل کی ایجاد سے پہلے لوگ دور دراز کا سفر کیسے کرتے تھے؟ صبح کے وقت اخبار پڑھتے ہوئے یہ سوال آپ کے ذہن میں پیدا ہو سکتا ہے کہ اخبارات کے جاری ہونے سے پہلے لوگوں کے لیے چیزوں کے بارے میں جاننے کا ذریعہ کیا تھا۔

ایسے تمام تاریخی سوالات وقت کے تعین کا اشارہ دیتے ہیں لیکن وقت کا تعین کسی مخصوص سال اور مہینے سے نہیں کیا جا سکتا۔ کسی زمانے میں ہونے والے واقعات کی تاریخوں کا تعین کر دینا کبھی کبھی غلط بھی ہوتا ہے۔ ہندوستان میں لوگوں نے اچانک چائے پینی شروع نہیں کی۔ اس کا ذوق پیدا کرنے میں طویل وقت لگا۔ اس کی کوئی تاریخ متعین نہیں کی جا سکتی۔ اسی طرح ہم ہندوستان پر برطانیہ کے تسلط قائم کرنے کی ایک متعین تاریخ نہیں دے سکتے یا ہندوستان کی قومی تحریک یا یہاں کی معیشت اور سماج میں جو تغیرات واقع ہوئے ہیں ان کی کوئی تاریخ متعین نہیں کر سکتے۔ یہ تبدیلیاں ایک طویل عرصہ میں واقع ہوتی ہیں۔ ہم اس کے لیے ایک دور مخصوص کر سکتے ہیں یعنی وقت کا ایک اندازہ جس میں مخصوص تبدیلیاں سامنے آئیں۔

پھر ہم تاریخ کے علم کو متعینہ تاریخوں سے کیوں وابستہ کرتے رہتے ہیں؟ یقیناً اس کا ایک سبب ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ تاریخ صرف جنگوں اور اہم واقعات کے مسلسل بیان کا نام تھا۔ اس میں حکمرانوں اور ان کی پالیسیوں کا ذکر ہوا کرتا تھا، مؤرخین بس یہ لکھ دیتے تھے کہ کس بادشاہ کی کس سنہ میں تاج پوشی ہوئی، کس سنہ میں اس کی شادی ہوئی، کس سنہ میں وہ صاحبِ اولاد ہوا، کس سنہ میں اس نے کوئی خاص جنگ لڑی، کس سنہ میں اس کا انتقال ہوا اور کس سنہ میں اس کا جانشین تخت پر بیٹھا۔ ایسے واقعات کی یقینی تاریخیں دی جا سکتی ہیں اور تاریخ کے علم میں ایسی ہی متعینہ تاریخوں پر بحث و مباحثہ کو اہمیت حاصل رہی ہے۔

جیسا کہ گذشتہ دو سال کی تاریخ کی نصابی کتابوں میں آپ نے دیکھا کہ مؤرخین ان تاریخ کے دوسرے بہت سے مسائل اور سوالات پر بھی لکھ رہے ہیں۔ ان باتوں سے ہمیں

شکل 2 - اشتہارات سے نئی چیزوں کا ذوق کیسے پیدا کیا جاتا تھا۔

لپٹن چائے کا 1922 کا یہ اشتہار بتاتا ہے کہ پوری دنیا میں اس کی اجارہ داری ہو گئی تھی۔ تصویر کے پسِ منظر میں ایک ہندوستانی محل کی پرانی دیوار ہے جب کہ سامنے ملکہ وکٹوریہ کا تیسرا بیٹا شہزادہ آرتھر جسے ڈیوک آف کناٹ کا خطاب ملا تھا، گھوڑے پر سوار ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کا ذریعۂ معاش کیا تھا، وہ کن اشیا کی کاشت کرتے تھے اور ان کی خوراک کیا تھی، ان کے شہر کیسے وسیع ہوتے تھے اور ان کی تجارت گاہوں میں ترقی کیسے ہوتی تھی، حکومت کیسے بنتی اور نئے خیالات لوگوں میں کیسے فروغ پاتے تھے، تہذیبوں اور معاشروں میں تبدیلیاں کیسے رونما ہوتی تھیں۔

شکل 3- وارن ہیسٹنگز 1773 میں ہندوستان کا پہلا گورنر جنرل مقرر ہوا۔
تاریخ کی کتابیں گورنر جنرلوں کے کارنامے بیان کرتی ہیں۔ سوانح نگاری میں ان کی شخصیت کو نمایاں کیا گیا ہے اور پینٹنگ ان کی طاقت کا مظہر ہیں۔

کون سی تاریخیں؟

متعینہ تاریخوں کی اہمیت کا معیار کیا ہو؟ جن تاریخوں کے گرد ہم گذشتہ تاریخ کا تانا بانا بُنتے ہیں بجائے خود ان کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ ان میں زندگی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ہم مخصوص واقعات کے کسی مجموعے کو اہمیت دیتے ہیں۔ اگر ان واقعات کے مطالعے سے ہماری توجہ ہٹ جائے اور ہم دوسرے مسائل کو اہمیت دینے لگیں تو نئی تاریخوں کا ایک نیا مجموعہ اہمیت حاصل کر لیتا ہے۔

ایک مثال لیجیے۔ ہندوستان میں برطانوی مؤرخین کی لکھی ہوئی تواریخ میں ہر گورنر کی بڑی اہمیت تھی۔ ان تاریخوں کی ابتدا پہلے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز کے عہدِ حکومت سے ہوا کرتی ہے اور اختتام آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن پر ہوتا ہے۔ الگ الگ ابواب میں ہم دوسرے گورنر جنرلوں — ہیسٹنگز، ولزلی، بنٹنک، ڈلہوزی، کیننگ، لارنس، لٹن، رِپن، کرزن، ہارڈِنگ اور اروِن کا تذکرہ پڑھتے ہیں۔ بظاہر یہ گورنر جنرل اور وائسرائے وغیرہ کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ تاریخ کی ان تمام کتابوں میں تاریخیں (Dates) انھیں کی شخصیات، انھیں کے کارناموں اور انھیں کی کامیابیوں سے متعلق ہوتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے علم کے لیے ان کی زندگیوں کے سوا اور کوئی شے اہمیت نہیں رکھتی اور ان کی زندگی کے ترتیب وار واقعات ہی برطانوی ہندوستان کی تاریخ کے مختلف ابواب کی نشان دہی کرتے ہیں۔

کیا اس دور کی تاریخ ہم دوسرے طریقے سے مرتب نہیں کر سکتے؟ گورنر جنرلوں کے اس سلسلے میں ہم ہندوستانی سماج کے مختلف طبقات اور گروہوں کے کردار کو کیسے نمایاں کر سکتے ہیں؟

جب ہم کوئی تاریخ یا کہانی لکھتے ہیں تو اسے ابواب میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ ایسا ہم

سرگرمی

اپنی والدہ یا گھر کے کسی دوسرے فرد کا ان کی زندگی کے بارے میں جاننے کے لیے انٹرویو لیجیے۔ ان کی زندگی کو مختلف ادوار میں تقسیم کیجیے اور ہر دور کے خاص واقعات کی فہرست بنائیے۔ اپنے ادوار کی تقسیم کی وجہ بھی بیان کیجیے۔

کیوں کرتے ہیں؟ اس لیے کہ بیان کیے گئے واقعات تسلسل اور بامعنی صورت اختیار کریں اور سمجھ میں آئیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ہم ان واقعات کو نمایاں کرتے ہیں جن سے ہماری کہانی ایک خاص صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس تاریخ سے جو برطانوی گورنر جنرلوں کے گرد گھومتی ہے ہندوستانیوں کی سرگرمیاں بالکل مشابہت نہیں رکھتیں۔ اس تاریخ میں ہندوستانیوں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ پھر ہم کیا کریں؟ یقیناً اپنی تاریخ کے لیے ہمیں دوسرا اندازِ بیان اختیار کرنا پڑے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پرانی تاریخوں کی اس طرزِ تحریر میں وہ اہمیت نہیں جو پہلے تھی۔ اب تاریخوں کا نیا مجموعہ جس کو ہمیں جاننا چاہیے، اہمیت کا حامل ہوگا۔

عہد کی تقسیم کیسے کریں؟

1817ء میں اسکاٹ لینڈ کے ایک ماہر معاشیات اور سیاسی فلسفی جیمز مل (James Mill) نے 'اے ہسٹری آف برٹش انڈیا' نامی تین ضخیم جلدوں میں ایک کتاب لکھی۔ اس کتاب میں اس نے ہندوستان کی تاریخ کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہندو، مسلم اور برطانوی۔ ادوار کی یہ تقسیم عام طور سے تسلیم بھی کر لی گئی۔ ہندوستان کی تاریخ کو اس نقطۂ نظر سے دیکھنے میں کیا آپ کے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا؟

ہم تاریخ کو مختلف ادوار میں تقسیم کیوں کرتے ہیں؟ ہم ایسا اس لیے کرتے ہیں تاکہ ہر دور کی خصوصیات پر جیسا کہ وہ اپنی مرکزی اہمیت کے ساتھ ظاہر ہوتی ہیں، قابو پاسکیں۔ ادوار کی تقسیم اسی لیے ناگزیر ہو جاتی ہے۔ چنانچہ جن اصطلاحوں کی بنیاد پر ہم ادوار کی تقسیم کرتے یعنی ایک دور کو دوسرے دور سے مختلف بتاتے ہیں وہ خاص اہمیت کی حامل ہو جاتی ہیں۔ وہ ماضی کے بارے میں ہماری فکر کی عکاسی کرتی ہیں۔ ان سے ہمیں ایک دور سے دوسرے دور کی خصوصیات میں تبدیلی کا احساس ہوتا ہے۔

مِل کا خیال تھا کہ تہذیبی اعتبار سے پورا ایشیائی سماج یوروپین سماج کے مقابلے میں پچھڑا ہوا ہے۔ اس کی تاریخ میں انگریزوں کی آمد سے پہلے ہندوستان میں ہندو اور مسلم حکمرانوں کی استبدادی حکومتیں قائم تھیں۔ سماج میں مذہبی عدم رواداری، ذات پات کی لعنت اور توہمات کا دور دورہ تھا۔ مل کے خیال میں برطانیہ یہاں تہذیب کا بول بالا کر سکتا تھا۔ اس

2019-20

مقصد کے لیے یوروپی طور طریقوں، فنون اداروں مدد اور قوانین کا یہاں نفاذ لازمی تھا۔ مِل کا نظریہ دراصل یہ تھا کہ روشن خیالی اور سماج میں سچی مسرت کو یقینی بنانے کے لیے انگریزوں کے لیے ہندوستان کو فتح کر لینا لازمی تھا کیوں کہ انگریزوں کی مدد کے بغیر ہندوستانی اس ترقی کے اہل نہیں ہو سکتے تھے۔ برطانوی تاریخ کے اس تصور کے مطابق حکومت تہذیب و ترقی کی تمام قوتوں کی نمائندہ تھی اور اس سے پہلے کا دور تاریک دور تھا۔ کیا اس فکر کو آج کے زمانے میں تسلیم کیا جا سکتا ہے؟

بہر حال کیا تاریخ کے کسی عہد کو ہم ہندو عہد یا مسلم عہد کا نام دے سکتے ہیں؟ کیا ان ادوار میں مختلف عقائد کے لوگ بیک وقت موجود نہیں تھے؟ آخر ہم کسی دور کو حکمرانوں کے مذہب سے کیوں وابستہ کریں؟ ایسا کرنے کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ عوام کی زندگی اور طور طریقوں سے ہم صرف نظر کر رہے ہیں۔ یہ بات نظر انداز کرنے کی نہیں ہے کہ قدیم ہندوستان میں بھی تمام حکمراں ایک ہی عقیدے کے ماننے والے نہیں تھے۔

ادوار کی اس برطانوی تقسیم سے ہٹ کر مؤرخین نے عام طور پر تاریخ کو 'قدیم'، 'وسطیٰ' اور 'جدید' ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ اس تقسیم میں بھی مسائل پیدا ہوئے ہیں کیوں کہ یہ فکر بھی مغربی ادوار کی تقسیم سے مستعار ہے۔ اس میں عہد جدید کو تمام تر ترقیات، جدید کاری، سائنس، عقلیت، جمہوریت، آزادی اور مساوات سے جوڑ دیا گیا ہے۔ عہد وسطیٰ کا سماج ان تمام جدید ترقیاتی نعمتوں سے محروم تھا۔ اپنے مطالعے کے زمانے کو بیان کرنے کے لیے کیا جدید زمانے کی اس طرز تقسیم کو ہم بلا کسی تنقید کے قبول کر سکتے ہیں؟ جیسا کہ آپ اس کتاب میں دیکھیں گے کہ انگریزوں کے عہد حکومت میں عوام مساوات اور آزادی کے حامل نہیں تھے اور نہ ان کا دور معاشی افزائش اور ترقی کا دور تھا۔

اسی لیے بہت سے مؤرخین نے اسے 'نوآبادیاتی' عہد کا نام دیا ہے۔

نوآبادیات سے کیا مراد ہے؟

اس کتاب میں آپ پڑھیں گے کہ انگریزوں نے مقامی راجاؤں اور نوابوں کو کس طرح کچل کر ملک کو فتح کیا اور اپنی حکومت قائم کر لی۔ آپ دیکھیں گے کہ کس طرح انھوں نے سماج اور ملکی معیشت پر قبضہ کیا، اپنے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے محاصل پر تصرف کیا۔

اپنی ضرورت کی اشیا کوڑیوں کے مول خریدیں اور غلے کی برآمد کے لیے زراعت پر قبضہ حاصل کیا۔ ان سب باتوں کے نتیجے میں راہ پانے والی تبدیلیوں کو بھی آپ سمجھ سکیں گے۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ برطانوی اقتدار نے یہاں کی تہذیبی اقدار، لوگوں کے ذوق اور معاشرے کے رسم و رواج میں کیا تبدیلیاں پیدا کیں۔ جب کسی ملک کو اس طرح زیرِ دست کیا جائے کہ تمام سیاسی، معاشی، سماجی اور تہذیبی قدریں بدل کر رکھ دی جائیں تو اس عمل کو ''نو آبادکاری'' (Colonisation) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن آپ بہر حال یہ دیکھیں گے کہ تمام طبقات میں تبدیلی کا عمل یکساں نہیں ہوا ہے۔

ہم یہ کیسے جانیں گے؟

گزشتہ ڈھائی سو سال کی ہندوستانی تاریخ لکھنے کے لیے مؤرخین کون سے ذرائع استعمال کرتے ہیں؟

انتظامیہ ریکارڈ فراہم کرتا ہے

ایک اہم ذریعہ برطانوی حکومت کے فراہم کردہ سرکاری ریکارڈ ہیں۔ انگریز تحریر کی اہمیت پر یقین رکھتے تھے۔ ہر حکم، منصوبہ، پالیسی، فیصلہ، معاہدہ اور تحقیق کو صاف طور سے لکھا ہونا چاہیے۔ کیوں کہ ایک مرتبہ تحریر میں آ جانے کے بعد اس کے مطالعے اور اس پر بحث کرنے میں سہولت ہوتی ہے۔ اس یقین کی وجہ سے ایک انتظامی کلچر وجود میں آیا جس میں حکم ناموں، شذرات اور اطلاعات کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔

شکل 4- نیشنل آرکائیوز آف انڈیا (قومی آثار قدیمہ ہند) *1920* کی دہائی میں وجود میں آیا۔ جب نئی دہلی تعمیر ہوئی اس وقت نیشنل میوزیم اور نیشنل آرکائیوز (قومی عجائب گھر) دونوں وائسرائے کے محل ہی سے متصل تھے۔ اس سے انگریزوں کے لیے ان محکموں کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔

ماخذ 1

محکمہ داخلہ کو دی گئیں رپورٹیں

1946 میں ہندوستان میں نو آبادیاتی حکومت رائل انڈین نیوی کے جہازوں میں پھوٹ پڑنے والی سرکشی کو دبانے کی کوشش میں تھی۔ مختلف بندرگاہوں کی طرف سے محکمہ داخلہ کو موصول ہونے والی رپورٹوں میں سے چند یہاں درج ہیں:

بمبئی: جہازوں اور ان کے نظام کو فوج کے قبضے میں دینے کے انتظامات مکمل کر لیے گئے ہیں۔ شاہی بحری بیڑا بندرگاہ سے باہر لنگر انداز ہے۔

کراچی: 301 باغیوں کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ کچھ مزید جن پر گہری سازش کا شک ہے، جلد ہی گرفتار کر لیے جائیں گے............ تمام انتظامیہ........... فوج کی نگرانی میں ہے۔

وشاکھاپٹنم: حالات مکمل طور سے قابو میں ہیں۔ کسی قسم کا کوئی تشدد نہیں ہوا۔ جہازوں اور انتظامیہ پر فوجی محافظین کا پہرہ بٹھا دیا گیا ہے۔ مزید کسی تشدد کا اندیشہ نہیں ہے سوائے اس کے کہ کچھ افراد کام پر آنے سے انکار کر دیں۔

ڈائریکٹر آف انٹلی جنس (محکمہ خفیہ) ہیڈکوارٹر، انڈیا کمانڈ، حالات کے بارے میں رپورٹ نمبر 7۔ فائل نمبر 5/21/46 داخلہ (پولیٹیکل) حکومت ہند۔

انگریز یہ بھی محسوس کرتے تھے کہ اہم دستاویزات اور خطوط کی مکمل حفاظت ہونی چاہیے۔ اس لیے انھوں نے تمام انتظامی دفاتر میں ریکارڈ روم کا ایک شعبہ قائم کیا۔ گاؤں میں تحصیل دار، کلکٹری (ضلعی)، کمشنری صوبائی سیکریٹریٹ اور عدالتوں میں دستاویزات کے تحفظ کے لیے شعبے قائم کیے۔ اہم دستاویزات کے خصوصی تحفظ کے لیے آثار قدیمہ کے محکمے اور میوزیم قائم کیے گئے۔

آثار قدیمہ کے میوزیم میں وہ خطوط اور حکم نامے آج بھی ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں جو ایک انتظامی دفتر سے دوسرے انتظامی دفتر کو انیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں بھیجے گئے تھے۔ ضلعی اہل کاروں کے تیار کیے ہوئے شذرات اور رپورٹیں یا احکام اور ہدایت نامے جو صوبائی حکومتوں کے اعلیٰ افسران کی طرف سے صوبائی منتظمین کے لیے جاری کیے گئے تھے، آپ آج بھی دیکھ سکتے ہیں۔

انیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں ان دستاویزات کو احتیاط کے ساتھ نقل کیا جاتا اور خطاطوں کے ذریعے نہایت خوبصورت انداز میں لکھا جاتا تھا۔ انیسویں صدی کے وسط میں چھاپہ خانے کی ایجاد کے بعد حکومت کے تمام محکموں کی کارروائیوں کی دستاویزات کی بہت سی نقول طبع ہوئیں۔

شکل 5-
شریفہ کا پودہ،
1770 کی دھائی

انگریزوں کے تیار کیے ہوئے نباتاتی باغ (بوٹانیکل گارڈن) اور ان کی قائم کی ہوئی طبعی اشیا کی نمائش گاہ (نیچرل ہسٹری میوزیم) نے پودوں کے نمونے جمع کیے اور ان کے استعمالات کی تفصیل معلوم کی۔ مقامی مصوروں سے ان نمونوں کی تصویریں بنوائی گئیں۔ مورخین اب اس بات کی تحقیق کر رہے ہیں کہ یہ اطلاعات کیسے فراہم کی گئیں، نیز یہ کہ یہ اطلاعات نوآبادیاتی نظام کے کس ذہن کو آشکارا کرتی ہیں۔

پیمائش (Survey) کی اہمیت

نوآبادیاتی نظام میں پیمائش کا کام عمومی طور سے ہوا۔ انگریز اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ کسی ملک پر اقتدار قائم رکھنے کے لیے اس ملک سے مکمل واقفیت ہونی چاہیے۔

انیسویں صدی کی ابتدا میں پورے ملک کی تفصیلی پیمائش کا کام انجام دیا گیا۔ گاؤں کی آمدنی کا حساب لگایا گیا۔ مقامات اور زمینوں کی تفصیلات، نباتات اور حیوانات، مقامی روایات، زراعت کے طریقے اور تمام حقائق سے واقفیت حاصل کی گئی جس سے کسی علاقہ کے انتظام میں مدد حاصل ہو۔ انیسویں صدی کے اختتام سے ہر دس سال کے بعد مردم شاری کی جانے لگی جس سے ہندوستان کے تمام صوبوں میں افراد کی تعداد ذات، مذہب اور پیشوں کی تفصیلات حاصل ہوئیں۔ ان کے علاوہ بھی اور کئی طرح کے تحقیقی جائزے ہوئے جیسے نباتاتی، حیاتیاتی، آثاری (آرکیالوجیکل)، انسانی اور جنگلاتی سروے۔

دفتری ریکارڈوں سے کیا معلوم نہیں ہوتا

دستاویزات کے اس انبار سے ہمیں بہت سی باتوں کا علم ہوتا ہے لیکن یہ بات ذہن نشین رہے کہ یہ سب سرکاری کی دستاویزات ہیں۔ یہ دستاویزات ہمیں بتاتی ہیں کہ اس وقت کے اہل کار کیا سوچتے تھے ان کی دلچسپی کن چیزوں میں تھی اور آئندہ نسلوں کے لیے وہ کون سی چیزیں محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ یہ دستاویزات ہمیں یہ سمجھنے میں ہمیشہ مدد نہیں کرتیں کہ ملک کے دوسرے لوگ کیا محسوس کر رہے تھے اور ان کے افعال کے پیچھے کیا مقاصد پوشیدہ تھے۔

اس کے لیے ہمیں دوسری طرف بھی دیکھنا پڑے گا۔ جب ہم دوسرے ذرائع کو تلاش کرتے ہیں تو وہ کثیر تعداد میں ہمیں مل جاتے ہیں۔ حالاں کہ دفتری ریکارڈ حاصل کرنے کے مقابلے میں ان کا حصول دشوار ہوتا ہے۔ ہمیں لوگوں کے روز ناموں، زائرین اور سیاحوں کے سفرناموں، اہم شخصیات کی خودنوشت سوانح عمریوں اور مقامی بازاروں میں بکنے والی معمولی کتابوں میں انھیں تلاش کرنا پڑتا ہے۔ طباعت کے فروغ کے بعد اخبارات
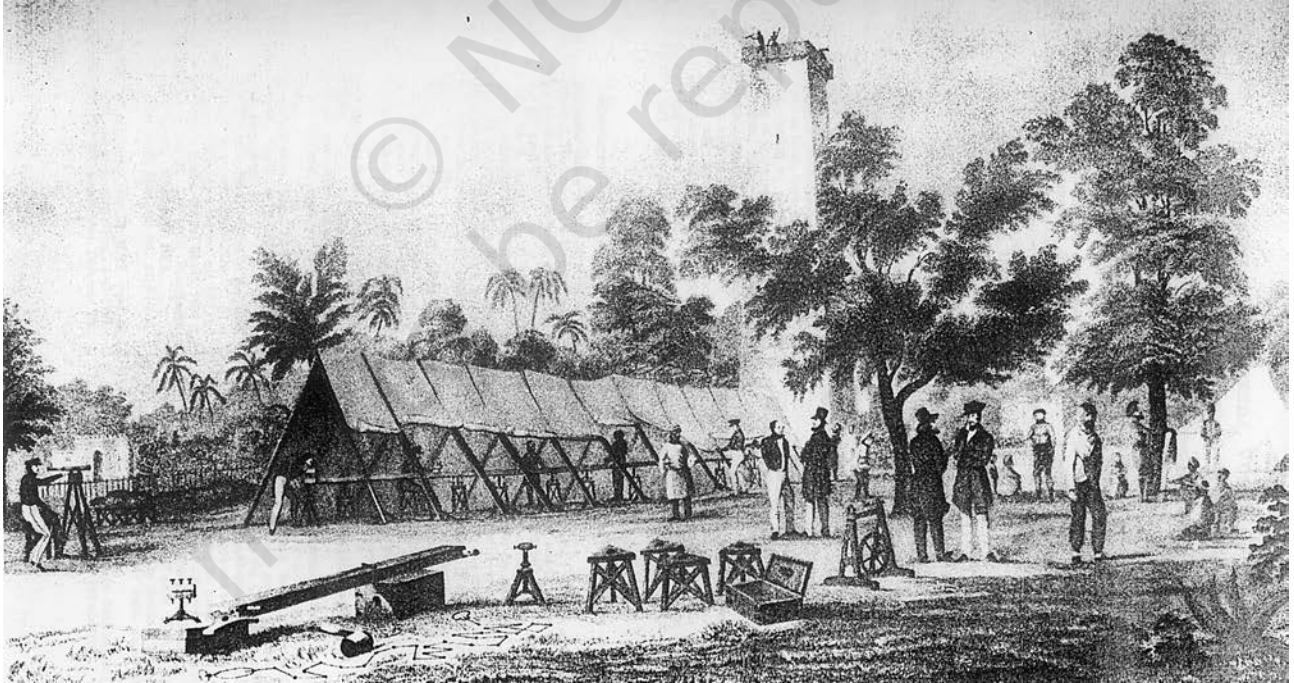
شکل 6 - بنگال میں نقشہ نویسی اور پیمائش کا کام۔ جیمز پرنسپ کی بنائی ہوئی تصویر، 1832
پیمائش میں استعمال ہونے والے سامنے رکھے ہوئے آلات اس کام کی سائنسی نوعیت کو نمایاں کرتے ہیں۔

ماخذ 2

''انسانوں کے کھانے لائق نہیں''

اخبارات ملک کے مختلف علاقوں میں جاری تحریکات کی روداد بیان کرتے ہیں۔ذیل میں 1946 میں کی گئی پولیس ہڑتال کی رپورٹ درج ہے۔

دہلی کے 2000 سے زیادہ پولیس والوں نے جمعرات کی صبح کو کھانے سے انکار کر دیا۔ وہ اپنی معمولی تنخواہوں اور پولیس لائنز کے باورچی خانوں سے فراہم کردہ خراب معیار کے کھانوں کے خلاف احتجاج کر رہے تھے۔

جیسے ہی یہ خبر دوسرے پولیس اسٹیشنوں تک پہنچی وہاں کے لوگوں نے بھی کھانے سے انکار کر دیا۔ احتجاج کرنے والوں میں سے ایک نے کہا: ''پولیس لائنز کچن سے فراہم کردہ غذا انسانوں کے کھانے لائق نہیں ہے۔ ہمیں جو دال اور چپاتیاں کھانی پڑتی ہیں، مویشی بھی انھیں کھانا پسند نہیں کریں گے۔''

ہندوستان ٹائمس
22مارچ 1946

شکل 7 – 1857 کے باغی

اس تصویر کی شبیہوں کا بغور مطالعہ کیجیے کیوں کہ یہ بنانے والے کے نقطہ نظر کی عکاسی کرتی ہیں۔ زیر نظر تصویر 1857 کی بغاوت کے بعد انگریزوں کی بہت سی کتابوں میں ملے گی۔ اس کی زیریں تحریر میں آپ کو یہ عبارت ملے گی۔ ''غدار سپاہی لوٹ کے مال میں حصہ لگاتے ہوئے'' برطانوی فکر کے اعتبار سے غدار سپاہی حریص، بداطوار اور خونخوار معلوم ہوتے ہیں۔ آپ اس بغاوت کے بارے میں پانچویں باب میں پڑھیں گے۔

شائع ہونے لگے اور مسائل پر لوگوں میں مباحثہ کا بھی آغاز ہو گیا۔ لیڈروں اور اصلاح پسندوں نے اپنے خیالات کو پھیلایا۔ شعرا اور ناول نگاروں نے اپنے احساسات کو قلم بند کیا۔

بہرحال یہ تمام ذرائع تعلیم یافتہ لوگوں کے خیالات ہی سے پیدا ہوتے ہیں۔ ہم ان ذرائع سے تاریخ کے ان تجربات کو معلوم نہیں کر سکتے جو قبائلی افراد اور کسان، کان کن یا گلی کوچوں میں رہنے والوں کے تجربات ہیں۔ ان کی زندگی سے واقفیت حاصل کرنا ایک مشکل امر ہے۔

اگر تھوڑی سی کوشش کریں تو یہ کام بھی ہم کر سکتے ہیں۔ جب آپ یہ کتاب پڑھیں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس کام کو کیسے انجام دیا جا سکتا ہے۔

سرگرمی

ماخذات 1 اور 2 کو دیکھیے۔ کیا آپ کو ان کی رپورٹنگ کے انداز میں فرق محسوس ہوتا ہے؟ اپنے مشاہدے کو بیان کیجیے۔

تصور کیجیے!

تصور کیجیے کہ آپ ایک مورخ ہیں اور آپ کو معلوم کرنا ہے کہ آزادی کے بعد ایک دور افتادہ قبائلی علاقے میں زراعت میں کیا کیا تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ اس تعلق سے مختلف ذرائع کی فہرست تیار کیجیے جن سے آپ یہ اطلاعات حاصل کرتے ہیں۔

دوہرائیے

1. بتائیے صحیح ہے یا غلط؟

(a) جیمز مل نے ہندوستان کی تاریخ کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ ہندو، مسلمان، عیسائی۔

(b) سرکاری دستاویزات ہمیں یہ سمجھنے میں مدد دیتی ہیں کہ ملک کے عوام کیا سوچتے ہیں۔

(c) انگریز سمجھتے تھے کہ تحقیقی جائزے ایک پراثر نظام کے لیے ضروری ہیں۔

گفتگو کیجیے

2. جیمز مِل کی ہندوستان کی تاریخ کی تقسیم ادوار میں کیا دشواری آئی؟

3. انگریز سرکاری دستاویزات کا تحفظ کیوں کرتے تھے؟

4. پولیس رپورٹ کے مقابلے میں پرانے اخبارات کی رپورٹیں ایک مورخ کے لیے الگ حیثیت کیوں رکھتی ہیں؟

کر کے دیکھیے

5. کیا آپ آج کی دنیا میں پیمائش کی مثال سوچ سکتے ہیں؟ غور کیجیے کہ کھلونے بنانے والی کمپنیاں نوجوانوں کی کھیلوں میں دلچسپی کا اندازہ کیسے لگاتی ہیں یا حکومت اسکولوں میں نوجوانوں کی تعداد کا پتہ کیسے لگاتی ہیں؟ ان جائزوں سے ایک مورخ کیا نتائج اخذ کرسکتا ہے؟

2

تجارت سے ملک گیری تک

کمپنی اقتدار حاصل کرتی ہے

اورنگ زیب آخری طاقتور مغل حکمراں تھا۔ اس نے موجودہ ہندوستان کے ایک بڑے حصّے پر اپنا اقتدار قائم کیا۔ 1707 میں اس کے انتقال کے بعد بہت سے مغل گورنروں (صوبے داروں) اور زمینداروں نے اپنی قوت آزمائی سے اپنی علاقائی حکومتیں قائم کرلیں۔ ہندوستان کے مختلف حصوں میں طاقت ور علاقائی حکومتوں کے ابھرآنے سے دہلی کی مرکزیت ختم ہوگئی۔

اٹھارھویں صدی کے نصف آخر تک ملک کے سیاسی افق پر برطانوی حکومت ایک نئی طاقت بن کر ابھرنے لگی تھی۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ برطانوی ابتدا میں ایک چھوٹی سی تجارتی کمپنی کی شکل میں آئے تھے اور ان کو اقتدار کی ہوس نہیں تھی؟ پھر آخر وہ ایک وسیع ملک کے مالک بن کیسے گئے؟ اس باب میں آپ دیکھیں گے کہ ایسا کیوں کر ہوا۔

شکل 1- کیپٹن ہڈسن بہادر شاہ ظفر اور ان کے بیٹوں کو قیدی بناتے ہوئے۔

اورنگ زیب کے بعد کوئی طاقتور مغل حکمراں نہیں رہا۔ لیکن مغل شہنشاہ علامتی طور سے اہمیت کے حامل رہے۔ درحقیقت جب 1857 میں برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت ہوئی تو اس وقت کے مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر از خود ایک قدرتی رہنما کے طور پر سامنے آگئے۔ جب انگریزوں نے اس بغاوت کو کچل دیا تو بہادر شاہ کو حکومت چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا، اور اس کے بیٹوں کو انتہائی بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کا مشرق میں داخلہ

شکل 2– اٹھارھویں صدی میں ہندوستان پہنچنے کے سمندری راستے۔

1600 میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ملکۂ برطانیہ الزبیتھ اوّل سے ایک فرمان حاصل کیا جس کی رو سے اسے مشرق میں تجارت کرنے کا مکمّل اختیار حاصل ہو گیا اور کسی دوسری کمپنی کو اس سے مقابلہ آرائی کا حق نہیں رہا۔ اس فرمان کی رو سے وہ سمندر پار نئے خطّوں میں اپنی تجارتی سرگرمیاں جاری رکھ سکتی تھی اور سستے داموں میں چیزیں خرید کر یوروپ میں مہنگے داموں میں فروخت کر سکتی تھی۔ اب کمپنی کو دوسری برطانوی کمپنیوں سے مقابلے کا خطرہ نہ تھا۔ اس زمانے میں **مرکنٹائل** تجارتی کمپنیاں دوسری کمپنیوں کی مقابلہ آرائی سے بچ کر ہی کامیابی حاصل کر سکتی تھیں تاکہ ارزاں خرید اور گراں فروشی کا فائدہ تنہا انھیں کو حاصل ہو۔

مرکنٹائل – ایک تجارتی کمپنی جو بنیادی طور سے ارزاں خرید اور گراں فروشی سے نفع کماتی ہے۔

لیکن یہ شاہی فرمان دوسری یورپی طاقتوں کو مشرقی بازاروں میں داخل ہونے سے نہیں روک سکتا تھا۔ برطانوی جہاز براعظم افریقہ کے مغربی ساحل کو پار کر کے اور کیپ آف گڈ ہوپ کا چکّر کاٹتے ہوئے بحر ہند سے گزر کر برطانوی جہازوں کے ہندوستان پہنچنے سے پہلے پرتگالی وہاں پہنچ چکے تھے۔ حقیقت میں یہ ایک پرتگالی تفتیش کار واسکوڈی گاما ہی تھا جس نے 1498 میں ہندوستان پہنچنے کا یہ راستہ دریافت کیا تھا۔ سترھویں صدی کی ابتدا تک ڈچ (ہالینڈ والے) بھی بحر ہند کے راستے اپنے تجارتی امکانات کا جائزہ لے رہے تھے۔ جلد ہی فرانسیسی تاجر بھی اس منظر پر نمودار ہو گئے۔

مسئلہ یہ تھا کہ یہ ساری کمپنیاں ایک جیسی چیزوں کی خرید میں دلچسپی رکھتی تھیں۔ عمدہ ہندوستانی کپاس اور ریشم کی یوروپ کے بازاروں میں بڑی مانگ تھی۔ کالی مرچ، لونگ، الائچی اور دال چینی کی بھی یہاں زبردست مانگ تھی۔ یوروپی کمپنیوں کی اس تجارتی مقابلہ آرائی نے اشیا کی قیمت میں اضافہ اور فروخت کی قیمت میں کمی کر دی جس کے نتیجے میں نفع کی مقدار کم ہو گئی۔ ان کمپنیوں کی کامیابی کا واحد راستہ یہی رہ گیا تھا کہ حریف کمپنیوں کو راستے سے ہٹا دیا جائے۔ اپنی تجارتی منڈیوں کو بچانے کے لیے ان کمپنیوں کے درمیان

زبردست معرکہ آرائی شروع ہوگئی۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں یہ مسلسل ایک دوسرے کے جہازوں کو سمندروں میں غرق کرتے رہے۔ ان کے راستے روکتے رہے اور تجارتی سامان کے لانے لے جانے میں رکاوٹ ڈالتے رہے۔

جنگی ہتھیاروں کے ساتھ یہ تجارت ہوتی رہی ساتھ ہی حفاظت کی غرض سے تجارتی مقامات کو فصیل بند بھی کیا جاتا رہا۔ تجارتی مقامات فصیل بندی اور نفع بخش تجارت کی دھن کے نتیجے میں ان کمپنیوں اور مقامی حکمرانوں میں بری طرح ٹھن گئی۔ اب اپنی تجارت کو سیاست سے الگ رکھنا کمپنی کے لیے مشکل ہوگیا۔ آیئے دیکھیں یہ کیسے ہوا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی بنگال میں تجارت شروع کرتی ہے

انگریزوں کا سب سے پہلا کارخانہ (فیکٹری) دریائے ہگلی کے کنارے 1651 میں قائم ہوا۔ یہ وہ مرکز تھا جہاں سے کمپنی کے تاجران جنھیں فیکٹرس (Factors) کہا جاتا تھا اپنی سرگرمیاں انجام دیتے تھے۔ کارخانے میں مال گودام ہوا کرتا تھا جہاں برآمد کی جانے والی اشیا رکھی جاتی تھیں، اور دفاتر تھے جہاں کمپنی کے افسران بیٹھا کرتے تھے۔ جیسے جیسے کاروبار بڑھتا گیا کمپنی نے تاجروں پر زور ڈالا کہ وہ کارخانہ کے اطراف رہائش اختیار کریں۔ 1696 تک کمپنی والوں نے اس نو آبادی کے گرد ایک قلعہ بنانے کا آغاز کردیا۔ اس کے دو سال بعد انھوں نے مغل کارندوں کو رشوت دے کر تین دیہاتوں کی زمینداری کے حقوق دینے پر آمادہ کرلیا۔ ان میں ایک گاؤں کالی کاتا تھا، جو بعد میں ترقی کر کے کلکتہ بنا اور اب "کولکاتہ" کے نام سے مشہور ہے۔ کمپنی نے مغل شہنشاہ اورنگ زیب کو بغیر محصول ادا کیے تجارت کے لیے ایک فرمان جاری کرنے پر آمادہ بھی کرلیا۔

فرمان — شاہی حکم نامہ

شکل 3- مقامی کشتیاں مدراس میں جہازوں سے سامان لاتے ہوئے، مصور ولیم سیمپسن، 1867

کمپنی زیادہ سے زیادہ رعایت اور موجودہ رعایتوں سے ناجائز فائدہ حاصل کرنے میں مسلسل کوشاں رہی۔ مثال کے طور پر اورنگ زیب کے فرمان نے صرف کمپنی کو بلا محصول تجارت کرنے کی اجازت دی تھی۔ ان کے اہل کاروں کو جو ذاتی تجارت بھی کرتے تھے یہ رعایت حاصل نہیں تھی لیکن اسی بہانے انھوں نے تجارتی محاصل ادا کرنے بند کردیے۔ اس سے بنگال کی مال گذاری کو زبردست خسارے سے دوچار ہونا پڑا۔ پھر بنگال کا نواب مرشد قلی خاں کیوں احتجاج نہ کرتا؟

شکل 4- رابرٹ کلائیو

تجارت سے جنگوں تک

اٹھارھویں صدی کی ابتدا تک کمپنی اور بنگال کے نوابوں کے درمیان کشمکش بہت بڑھ گئی۔ اورنگ زیب کے انتقال کے بعد انھوں نے بھی اپنی طاقت اور خودمختاری کا استعمال شروع کردیا جیسا کہ دوسری علاقائی طاقتیں اس وقت کر رہی تھیں۔ مرشد قلی خاں کے بعد علی وردی خاں اور اس کے بعد سراج الدولہ بنگال کا نواب ہوا۔ ان میں سے ہر ایک طاقتور حکمراں تھا۔ انھوں نے کمپنی کو رعایت دینے سے انکار کردیا۔ تجارتی محاصل بڑھادیے۔ سکے ڈھالنے کا حق ختم کردیا اور ان کی قلعہ بندیوں پر روک لگادی۔ انھوں نے کمپنی پر دھوکہ دہی کا الزام لگایا اور کہا کہ کمپنی حکومت بنگال کو زبردست مالی خسارے سے دوچار کر رہی ہے اور اس طرح نوابوں کے اختیار کو سلب کر رہی ہے۔ کمپنی ٹیکس ادا کرنے سے انکار کر رہی ہے۔ اس کے خطوط توہین آمیز ہوتے ہیں اور یہ نواب اور اس کے افسروں کو ذلیل کر رہی ہے۔

کٹھ پتلی — ڈوریوں کے ذریعے ہلایا جانے والا ایک کھلونا۔ یہ ناپسندیدہ لفظ، ان لوگوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو دوسروں کے حکم کے غلام ہوتے ہیں۔

کمپنی نے جواباً کہا کہ مقامی اہل کاروں کے غیر منصفانہ مطالبات اس کی تجارت کو تباہ کر رہے ہیں اور یہ کہ تجارت اسی وقت ترقی کر سکتی ہے جب محاصل ختم کردیے جائیں۔ یہ بات بھی زور دے کر کہی گئی کہ تجارت میں توسیع کے لیے مقبوضات میں توسیع، مواضعات کی خرید اور قلعوں کا استحکام اور مرمت ضروری ہے۔

اس کشمکش سے مقابلہ آرائی کی نوبت آ پہنچی جس کے نتیجے میں پلاسی کی جنگ واقع ہوئی۔

کیا آپ جانتے ہیں؟

کیا آپ کو معلوم ہے کہ پلاسی نام کیسے پڑا؟ یہ ''پلاشی'' کا انگریزوں کا بگاڑا ہوا تلفظ ہے۔ یہ لفظ ''پلاش'' نام کے ایک درخت سے منسوب ہے جس میں سرخ رنگ کے خوبصورت پھول لگتے ہیں جس سے گلال حاصل ہوتا ہے، جو ہولی کے تہوار میں استعمال ہوتا ہے۔

پلاسی کی جنگ

1756 میں علی وردی خاں کے انتقال کے بعد سراج الدولہ بنگال کا نواب بنا۔ کمپنی اس کی قوت سے پریشانی میں مبتلا تھی۔ اسے ایک کٹھ پتلی حکمراں کی تلاش تھی جو اسے تجارتی

شکل 5 – جنرل کورٹ روم، ایسٹ انڈیا ہاؤس، لیڈن ہال اسٹریٹ کی تصویر
ایسٹ انڈیا کمپنی کے مالکان کی تنظیم لیڈن ہال اسٹریٹ، لندن میں واقع اسی کورٹ روم میں اپنی میٹنگیں منعقد کرتی تھی۔ یہ ایک میٹنگ کی تصویر ہے۔
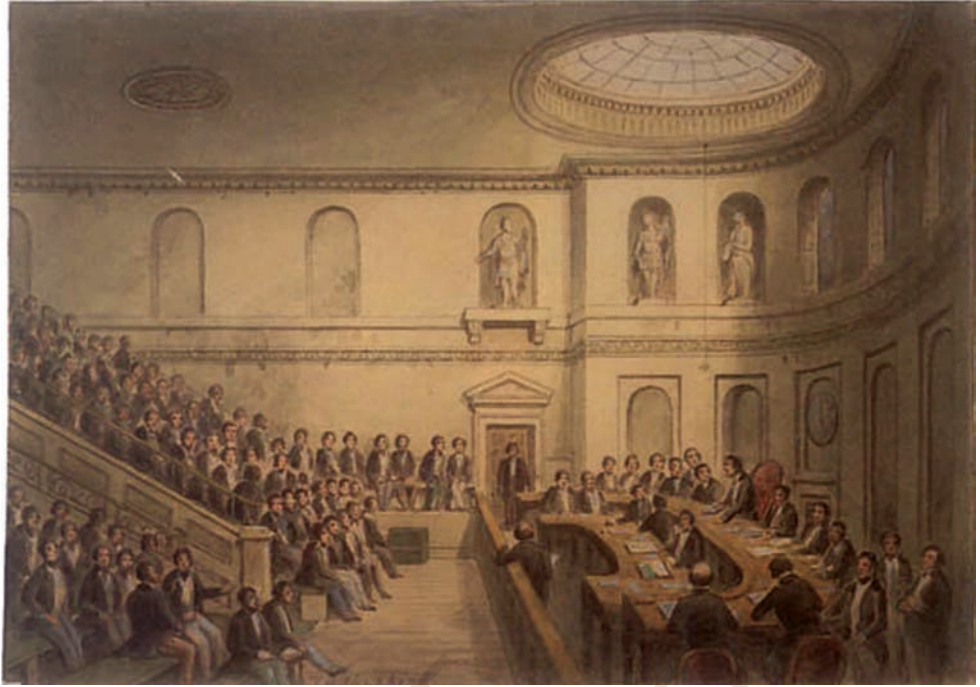
مراعات اور دوسرے فوائد کے حصول میں مدد دے سکے۔ اس لیے اس نے سراج الدولہ کے ایک مخالف کو حکمراں بنانے کی سازش کی لیکن اس میں اسے کامیابی نہیں ملی۔ ناراض ہو کر سراج الدولہ نے کمپنی کو حکومت کی مقامی سیاست سے باز رہنے، قلعہ بندیوں کو ختم کرنے اور محاصل ادا کرنے کا حکم دیا۔ مصالحت کی ناکامی کے بعد سراج الدولہ نے تیس ہزار سپاہیوں کے ساتھ قاسم بازار کی فیکٹری پر قبضہ کر لیا۔ اس کے کارندے قید کر لیے گئے۔ انگریزوں کو غیر مسلح کر دیا اور انگریزی جہازوں کی راہ مسدود کر دی۔ اس کے بعد اس نے کلکتہ کی طرف کوچ کیا تاکہ وہاں کمپنی کے قلعے پر قبضہ کر لے۔

ماخذ 1

دولت کا وعدہ

انگلینڈ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی اور نو آبادکاری کے عزائم کو شک وشبہ اور عدم اعتماد کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ پلاسی کی جنگ کے بعد رابرٹ کلائیو نے جنوری 1759 میں کلکتہ سے ولیم پٹ کو جو شاہ انگلستان کے پرنسپل سکریٹریوں میں سے تھا، یہ خط لکھا۔

''اگرچہ کسی تجارتی کمپنی کے لیے اقتدارِ اعلیٰ کا حصول ایک بڑی بات سمجھی جائے گی لیکن مجھے اس بات پر فخر ہے کہ................ان مال دار حکومتوں پر مکمل قبضہ حاصل کرنے میں بہت کم یا بالکل دقت پیش نہیں آئے گی۔

..........میں یہ فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں کہ دو ملین اسٹرلنگ (بیس لاکھ پونڈ) سالانہ کی آمدنی اور تین صوبوں کی حکومتیں..................کیا لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں بنیں گے؟..............''

2019-20

ماخذ 2

نواب کی شکایت

1733 میں انگریز تاجروں کے بارے میں بنگال کے نواب نے یہ کہا:

''جب یہ ملک میں پہلی بار آئے تو انھوں نے اس وقت کی حکومت سے عاجزانہ درخواست کی کہ ہمیں زمین کا ایک قطعہ قیمتاً دیا جائے تاکہ ہم یہاں ایک فیکٹری قائم کر سکیں۔ یہ درخواست آسانی سے منظور ہوگئی لیکن انھوں نے فوراً ہی ایک مضبوط قلعہ تعمیر کرلیا جس کے گرد خندق تھی اور آمد و رفت کا راستہ دریا کی طرف سے تھا۔ فصیل پر انھوں نے بہت بڑی تعداد میں توپیں چڑھا دیں۔ انھوں نے بہت سے تاجروں اور دوسروں کو یہاں پناہ لینے پر آمادہ کیا اور ان سے خراج وصول کرنے لگے جس کی مالیت ایک لاکھ روپے تک پہنچتی تھی۔ انھوں نے بادشاہ کی رعایا میں سے کثیر تعداد میں مردوں اور عورتوں کو غلام بنا کر اپنے ملک کو بھیجا۔''

جب کلکتہ پر قبضہ کی خبر مدراس پہنچی تو وہاں کے ذمہ داروں نے رابرٹ کلائیو کی سرکردگی میں جنگی بحری بیڑے کے ساتھ ایک فوج روانہ کی۔ نواب کے ساتھ طویل گفت و شنید ہوئی اور بالآخر 1757 میں پلاسی کے میدان میں لارڈ کلائیو نے سراج الدولہ کے خلاف اپنی افواج جمع کرلیں۔ اس جنگ میں سراج الدولہ کی شکست کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ کلائیو نے اس کے ایک سپہ سالار میر جعفر کو نواب بنانے کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ اس لیے میر جعفر نے جنگ میں حصہ نہیں لیا۔

پلاسی کی جنگ کی شہرت اس لیے ہوئی کہ اس میں انگریزوں نے ہندوستان میں پہلی بڑی فتح حاصل کی۔

پلاسی کی شکست کے بعد سراج الدولہ کو قتل کر دیا گیا اور میر جعفر کو نواب بنا دیا گیا۔ کمپنی ابھی تک انتظامیہ کو اپنے ہاتھ میں لینے کی خواہش مند نہیں تھی۔ اس کا اصل مقصد تجارت کو وسیع کرنا تھا۔ اگر یہ مقصد ملک گیری کے بغیر مقامی حکمرانوں کے تعاون سے حاصل ہوسکتا تھا تو براہ راست سرحدوں اور علاقوں کی فتح ضروری نہیں تھی۔

جلد ہی کمپنی نے محسوس کرلیا کہ یہ کام قدرے مشکل ہے کیوں کہ کٹھ پتلی نواب بھی کمپنی کی خواہشات کو جیسا کہ وہ چاہتی تھی پورا کرنے سے قاصر تھے۔ اب اسے تو رعایا کے سامنے اپنی عزت باقی رکھنے کے لیے اقتدار کی نمائش کرنا ضروری ہوگیا تھا۔

پھر کمپنی کیا کرسکتی تھی؟ جب میر جعفر نے احتجاج کیا تو کمپنی نے اسے معزول کر کے اس کی جگہ میر قاسم کو بٹھا دیا۔ جب میر قاسم نے شکایت کی تو اسے 1764 میں بکسر کے مقام پر شکست دے کر بنگال سے باہر نکال دیا اور میر جعفر کو پھر گدّی پر بٹھا دیا۔ نواب کو پانچ لاکھ روپیہ ماہانہ کمپنی کو ادا کرنا تھا لیکن کمپنی جنگ کے اخراجات اور تجارتی ضروریات کے لیے مزید رقم کی خواہش مند تھی۔ اسے اپنی سرحدوں اور آمدنی میں اضافہ کرنا بھی مقصود تھا۔ 1765 میں میر جعفر کے انتقال کے بعد کمپنی کی نیت بدل گئی اور کٹھ پتلی نوابوں کو اپنے حسب مقصد نہ پاتے ہوئے کلائیو نے اعلان کر دیا کہ ''اب ہمیں خود ہی نواب بننا پڑے گا۔''

آخر کار 1765 میں مغل شہنشاہ نے کمپنی کو صوبہ بنگال کا دیوان مقرر کر دیا۔ یہ دیوانی کمپنی کو اجازت دیتی تھی کہ وہ بنگال کے عظیم وسائل کو اپنے استعمال میں لائے۔ اس سے

کمپنی کا مسئلہ حل ہو گیا جس میں پہلے وہ اپنے کو گھرا ہوا پاتی تھی۔ اٹھارھویں صدی کی ابتدا ہی سے ہندوستان میں اس کی تجارت بہت بڑھ چکی تھی لیکن اسے اپنی بہت سی ضروریات انگلستان سے درآمد کیے جانے والے سونے اور چاندی کے عوض خریدنی پڑتی تھیں۔ ایسا اس لیے تھا کہ برطانیہ کے پاس اس وقت ہندوستان میں فروخت کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ برطانیہ سے سونے کی آمد جنگ پلاسی کے بعد کم اور دیوانی کے حاصل ہونے کے بعد بالکل بند ہو گئی۔ کمپنی کو اب ہندوستان ہی کے محاصل سے اپنے تمام اخراجات پورے کرنے تھے۔ ان محاصل سے کپاس اور ریشم کی خریداری، کمپنی کے فوجوں کے اخراجات اور قلعوں اور دفاتر کی تعمیر کا کام لیا جاتا تھا۔

کمپنی کے اہل کاران ''نواب'' بن گئے

نواب بن جانے کا کیا مطلب تھا؟ اس کا مطلب تھا کہ کمپنی کو زیادہ قوت اور اقتدار حاصل ہو گیا لیکن عملاً اس کا مطلب کچھ اور بھی تھا۔ یعنی اب کمپنی کا ہر ملازم خود کو نواب سمجھنے لگا تھا۔

پلاسی کی جنگ کے بعد بنگال کے اصل نواب کمپنی کے اہل کاروں کو اپنی زمینیں اور رقمیں تحفتاً دینے پر مجبور ہو گئے۔ رابرٹ کلائیو نے خود ڈھیروں مال جمع کیا۔ وہ 1743 میں اٹھارہ سال کی عمر میں انگلستان سے مدراس (موجودہ چنئی) آیا تھا اور جب 1768 میں ہندوستان سے واپس گیا تو اس کی ذاتی دولت کی مالیت چار لاکھ ایک ہزار ایک سو دو پونڈ (£4,01,102) تھی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جب 1764 میں اسے بنگال کا گورنر بنایا گیا تھا تو اسے یہ ذمہ داری دی گئی تھی کہ کمپنی کی انتظامیہ سے رشوت کا خاتمہ کرے لیکن پارلیمنٹ نے اس کی کثیر دولت پر مشتبہ ہو کر 1772 میں اسی کے خلاف رشوت کا مقدمہ چلایا۔ اگرچہ اس مقدمے میں بری کر دیا گیا لیکن اس نے 1774 میں خودکشی کر لی۔

لیکن کمپنی کے سبھی ملازمین دولت اکٹھا کرنے میں کلائیو کی طرح خوش نصیب نہیں تھے۔ ان میں سے بہت سے جلد ہی موت کے آغوش میں پہنچ گئے۔ بعض بیماریوں کی وجہ سے اور بعض جنگوں میں۔ اس لیے ان سبھوں کو بے ایمان اور رشوت خور سمجھنا صحیح نہ ہوگا۔ ان میں اکثر معزز گھرانوں سے آئے تھے اور ان کی انتہائی خواہش یہاں زیادہ دولت اکٹھا کر کے انگلینڈ واپس ہونے کے بعد ایک آرام دہ زندگی گزارنے کی تھی۔ جو لوگ کثیر دولت

ماخذ 3

کلائیو کا اپنے بارے میں کیا خیال تھا؟

پارلیمنٹ کی کمیٹی کے سامنے اپنے مقدمے کی سماعت کے دوران کلائیو نے پلاسی کی جنگ کے بعد اپنے قابلِ فخر ضبط کا اعلان کرتے ہوئے یہ بیان دیا:

''ذرا اس وقت کے حالات کا تصور کیجیے جو پلاسی کی فتح کے بعد میرے سامنے پیش آئے۔ ایک عظیم شہزادہ میری خوشنودی حاصل کرنے پر مجبور تھا؛ ایک خوشحال شہر میرے قدموں تلے تھا؛ اس کے مالدار ترین ساہوکار میرے ایک پُر التفات تبسم کی امیدواری میں ایک دوسرے کے مقابل تھے، میں ایسے خزانوں کے درمیان سے گزر رہا تھا جو صرف میرے لیے تھے، ایک طرف سونا اور دوسری طرف جواہرات تھے! مسٹر چیرمین! ایسے نازک وقت میں اپنی ایمان داری پر میں خود حیران ہوں۔''

سرگرمی

خود کو کمپنی کا ایسا نوجوان افسر تصور کیجیے جو چند مہینے پہلے ہی انگلینڈ سے ہندوستان آیا ہے۔ اپنے گھر والوں کو ایک خط لکھیے جس میں یہاں کی خوش حال زندگی کا برطانیہ کی غریبی زندگی سے مقابلہ کا ذکر ہو۔

کے ساتھ واپس ہونے میں کامیاب ہو گئے انھوں نے پرتعیش زندگی گزارنے کے علاوہ دولت کی نمائش بھی کی۔انھیں ''نباب'' کہا جانے لگا جو ہندوستانی لفظ نواب کا انگریزی تلفظ ہے۔انگلینڈ کی سوسائٹی میں ان کی کوئی عزت نہیں تھی۔انھیں دولت کی نمائش کرنے والا سمجھا جاتا تھا جو اونچی سوسائٹی میں اپنی جگہ بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ڈراموں اور کارٹونوں میں ان کا مذاق بھی اڑایا جاتا تھا۔

شکل 6- اودھ کے نواب شجاع الدولہ اپنے بیٹوں اور برطانوی ریزیڈنٹ کے ساتھ۔مصور ٹِلّی کیٹل (1772)۔

بکسر کی جنگ کے بعد معاہدے نے نواب شجاع الدولہ کے اختیارات میں بھاری کمی کر دی۔اگرچہ وہ بظاہر اس تصویر میں شاہی شان وشوکت کے ساتھ ریزیڈنٹ سے برتر نظر آرہا ہے۔

کمپنی کی عمل داری بڑھتی ہے

اگر ہم 1757 اور 1857 کے درمیان ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعے ہندوستانی ریاستوں کے الحاق کا تجزیہ کریں تو چند بنیادی باتیں سامنے آتی ہیں۔کمپنی نے کسی نامعلوم سرحد کا الحاق کرنے کے لیے بہت ہی کم فوجی طاقت استعمال کی۔اس کے بجائے اس نے ہندوستانی مملکتوں پر قبضہ کرنے سے پہلے اپنے اثرات بڑھانے کے لیے مختلف سیاسی اور معاشی ہتھکنڈوں کو استعمال کیا۔

1764 میں بکسر کی جنگ کے بعد کمپنی نے ریاستوں میں اپنے نمائندے (ریزیڈینٹس) مقرر کرنے شروع کر دیے۔یہ سیاسی یا معاشی ایجنٹ ہوا کرتے تھے جن کا کام کمپنی کے مفادات کی حفاظت کرنا تھا۔ان نمائندوں کے ذریعے کمپنی نے ہندوستانی ریاستوں کے اندرونی معاملات میں مداخلت شروع کر دی۔وہ اس بات کا فیصلہ کرنے لگے کہ کون تخت کا وارث ہوگا اور کون انتظامی عہدوں پر فائض ہوگا؟ بعض اوقات کمپنی ریاستوں کو عہد معاونت (سبسیڈیری الائنس) قبول کرنے پر مجبور کرتی تھی۔اس معاہدہ کے تحت ہندوستانی حکمرانوں کا آزادانہ فوج رکھنے کا حق سلب ہو جاتا تھا۔ان کی حفاظت کمپنی کی ذمہ داری تھی لیکن انھیں ان معاون افواج کا خرچ، جو تحفظ کے مفروضے کے تحت کمپنی کی ذمہ داری تھی، ادا کرنا پڑتا تھا۔اگر ہندوستانی حکمراں یہ ادائیگی نہیں کر پاتے تھے تو ان کی سلطنت کا کچھ حصہ بطور جرمانہ ضبط کر لیا جاتا تھا۔مثال کے طور پر رچرڈ ویلزلی جب گورنر جنرل (1805-1758) تھا تو اعانتی فوج کے اخراجات کے لیے نواب اودھ کو 1801 میں اپنی آدھی سلطنت سے ہاتھ دھونا پڑا، نظام حیدرآباد کو بھی اسی بنیاد پر اپنا علاقہ مجبوراً انگریزوں کے حوالے کرنا پڑا تھا۔

شکل 7- ٹیپو سلطان

ماخذ 4

ریزیڈنٹ کے اختیارات کیا تھے؟

اسکاٹ لینڈ کے مشہور ماہر معاشیات اور سیاسی مفکر جیمز مل نے کمپنی کے مقرر کردہ نمائندوں کے اختیارات کے بارے میں یہ لکھا ہے۔

''جس کو ہم ریزیڈنٹ مقرر کرتے ہیں وہ عدم مداخلت کے لیے حکم امتناعی نافذ کرنے کے معاملے میں صحیح معنوں میں ملک کا بادشاہ ہوتا ہے۔ جب تک شہزادگان پوری اطاعت اور فرماں برداری بجالاتے ہیں اور ریزیڈنٹ کی مرضی کے مطابق یعنی حکومت برطانیہ کے لیے قابل قبول طریقہ اختیار کرتے ہیں، کوشش کی جاتی ہے کہ ریزیڈنٹ ان کے انتظامی معاملات میں مداخلت نہ کرے، لیکن جیسے ہی شہزادہ اس کے خلاف کوئی عمل کرتا ہے اور جسے انگریزی حکومت غلط سمجھتی ہے فوراً ہی تصادم کا آغاز ہو جاتا ہے اور خلفشار پھیل جاتا ہے۔''

جیمز مل (1832)

ٹیپو سلطان — ''شیر میسور''

سیاسی یا معاشی مفادات کو جہاں بھی خطرہ لاحق ہوتا تھا کمپنی فوراً وہاں فوجی کارروائی کا آغاز کر دیتی تھی۔ اس کا نمونہ ہم جنوبی ہندوستان کی ریاست میسور میں دیکھتے ہیں۔

میسور، حیدر علی (حکومت 1761 تا 1782) اور اس کے نامور بیٹے ٹیپو سلطان (حکومت 1782 تا 1799) کی قیادت میں ایک زبردست قوت بن کر ابھرا۔ میسور کا مالابار کے ساحل پر مکمل قبضہ تھا جہاں سے انگریز گرم مصالحہ (الائچی اور کالی مرچ) کی خریداری

شکل 8 – کارنوالس، ٹیپو سلطان کے بیٹوں کو یرغمال بناتے ہوئے۔ (مصور ڈینیل آرمے، 1793)
کمپنی کی فوجیں کئی میدانوں میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان سے شکست کھا چکی تھیں لیکن 1792 میں مرہٹوں، نظام اور انگریزوں کی متحدہ افواج کے مقابلہ میں ٹیپو سلطان کو ایک معاہدہ کے تحت اپنے دو بیٹوں کو انگریزوں کے پاس یرغمال رکھنا پڑا۔ برطانوی مصور ہمیشہ انگریزوں کی کامیابیوں کی تصویریں بنا کر خوشی محسوس کیا کرتے تھے۔

کرتے تھے۔ 1785 میں ٹیپو سلطان نے اپنی بندرگاہوں سے صندل، الائچی اور کالی مرچ کی برآمد پر پابندی عائد کردی اور اپنی حدودِ مملکت میں تاجروں کو کمپنی سے کاروبار کرنا ممنوع قرار دے دیا۔ اس نے فرانسیسیوں سے تعلقات استوار کیے اور ان کی مدد سے اپنی فوجوں کو نئے طریقے سے مستحکم کیا۔

ٹیپو سلطان کے اس فیصلے سے برطانوی آپے سے باہر ہوگئے۔ انھوں نے حیدر علی اور ٹیپو سلطان کو حوصلہ مند، مغرور اور خطرناک سمجھتے ہوئے ان پر قابو پانا اور انھیں کچل دینا ضروری سمجھا۔ میسور سے 1767 تا 1769، 1780 تا 1784، 1790 تا 1792 اور 1799 میں چار جنگیں لڑی گئیں۔ ان میں سے آخری جنگ میں جو سرنگا پٹنم میں لڑی گئی، ٹیپو سلطان اپنی حکومت کا دفاع کرنے کے بعد مارا گیا۔ انگریز فتح یاب ہوئے اور میسور کو وہاں کے سابق حکمراں خاندان ''وڈیار'' کے حوالے کر کے ان پر ''عہد معاونت'' (Subsidiary Alliance) نافذ کر دیا گیا۔
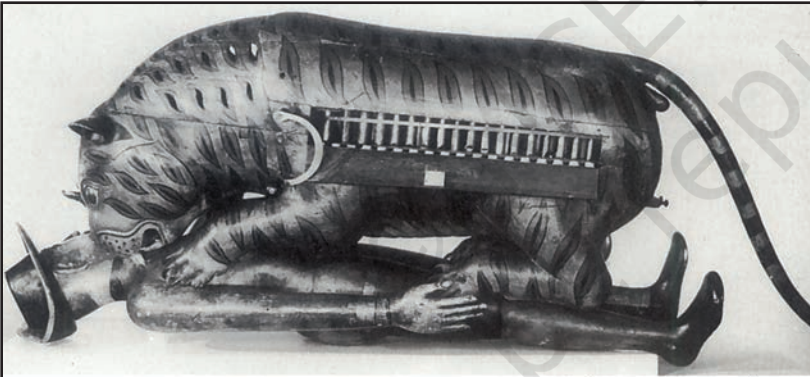
شکل 9- ٹیپو کا کھلونا شیر

یہ ٹیپو کے ایک بڑے مشینی شیر کی تصویر ہے۔ اس میں آپ شیر کو ایک انگریز کو بھنبھوڑتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں۔ جب اس کا ہینڈل گھمایا جاتا ہے تو شیر دہاڑتا اور انگریز چیختا تھا۔ یہ کھلونا شیر اب وکٹوریہ اینڈ البرٹ میوزیم میں ہے۔ سرنگا پٹنم کا دفاع کرتے ہوئے 4 مئی 1799 کو ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد یہ کھلونا انگریزوں کے ہاتھ آیا۔

ٹیپو کا فسانۂ شجاعت

عوام کی عقیدت کی بنا پر بادشاہ اکثر اپنے افسانوی کردار اور شجاعت کے لیے مشہور ہو جاتے ہیں۔ یہ سلطان ٹیپو کا فسانۂ شجاعت ہے جو 1782 میں میسور کا حکمراں بنا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ وہ ایک فرانسیسی دوست کے ساتھ جنگل میں شکار کھیلنے گیا۔ وہاں اس کا ایک شیر سے سامنا ہوگیا۔ اس کی بندوق نے اس وقت ساتھ دینے سے انکار کر دیا اور خنجر بھی زمین پر گر گیا۔ اس نے کسی اسلحہ کے بغیر شیر سے مقابلہ کیا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے خنجر پر قبضہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس مقابلے میں اس کی فتح ہوئی اور شیر مارا گیا۔ اس کے بعد اس کی شہرت ''شیرِ میسور'' کے نام سے ہوئی۔ اس کے پرچم کی علامت بھی ''شیر'' تھا۔

مراٹھوں سے جنگ

اٹھارھویں صدی کی ابتدا ہی سے کمپنی نے مراٹھوں کی قوت کو کچلنے اور انھیں تباہ کرنے کی کمر باندھی تھی۔ 1761 میں پانی پت کی تیسری جنگ میں شکست کھانے کے بعد مراٹھوں کا دہلی

2019-20

پر حکومت کا خواب چکنا چور ہو گیا۔ وہ چار سلطنتوں میں بٹ گئے جن پر چار خاندانوں سندھیا (گوالیر)، ہولکر (اندور)، گا یکواڑ (بڑودہ) اور بھونسلے (ناگپور) کی حکومت تھی۔ یہ تمام ایک وفاق (Confederacy) کے تحت جمع ہو گئے۔ ان کا وفاقی امیر وزیر اعظم یا پیشوا تھا جس کا مرکز پونا میں تھا۔ پیشوا تمام حکومتوں کے انتظامی اور فوجی امور کا نگراں ہوتا تھا۔ مہاد جی سندھیا اور نانا پھڑنس (پھڑنویس) اٹھارھویں صدی کے دو بڑے جنگجو اور سیاسی مدبّر تھے۔

مراٹھوں سے مسلسل جنگ کر کے انھیں مغلوب کر لیا گیا۔ پہلی جنگ میں، جس کا اختتام 1782 میں ''سالبائی معاہدہ'' کی شکل میں ہوا، کوئی فریق فاتح نہیں تھا۔ مراٹھوں اور انگریزوں کی دوسری جنگ (1803 تا 1805) مختلف محاذوں پر ہوئی جس میں اڑیسہ اور دریائے جمنا کے شمالی علاقوں بشمول آگرہ اور دہلی پر انگریزوں کو اقتدار حاصل ہو گیا۔ بالآخر 1817 تا 1819 میں لڑی گئی تیسری مراٹھا—انگریز جنگ میں مراٹھوں کو بالکل کچل دیا گیا۔ پیشوا کو جلاوطن کر کے کانپور کے قریب بٹھور میں نظر بند کر دیا گیا اور اس کی پینشن مقرر کر دی گئی۔ اس طرح کمپنی کو وندھیاچل کے جنوبی علاقوں پر مکمل اختیار حاصل ہو گیا۔

سرگرمی

تصور کیجیے کہ آپ کے پاس سرنگاپٹنم کی جنگ اور ٹیپو سلطان کی شہادت کے واقعات پر مبنی دو طرح کے اخبارات ہیں۔ ایک برطانیہ اور دوسرا میسور کا۔ آپ دونوں اخبارات کی سرخیاں لگائیے۔

بالادستی کا حق

مندرجہ بالا سطور سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انیسویں صدی کی ابتدا ہی سے انگریز حدودِ مملکت کی توسیع کے لیے جارحیت کی پالیسی پر عمل پیرا تھے۔ گورنر جنرل لارڈ ہیسٹنگز (1813 تا 1823) نے اپنے عہد میں ایک نئی پالیسی کا اعلان کیا جس کو ''بالا دستی کا حق (Policy of Paramountcy)'' کا نام دیا گیا۔ اس کے تحت کمپنی نے یہ حق جتایا کہ اس کا اختیار سب سے اعلیٰ ہے۔ اس لیے اس کی طاقت تمام ریاستوں سے بالاتر ہے۔ اس حق کے تحفظ کے لیے کمپنی کو اس بات کا حق ہوگا کہ ہندوستانی حکومتوں کو اپنے اختیارات کے تحت ضم کر لے یا ایسا کرنے کی دھمکی دے۔ برتری کا یہ خیال بعد میں برطانوی پالیسیوں کا رہنما اصول بن گیا۔

یہ طریق کار بہرحال ایسا نہیں تھا کہ جسے کوئی چیلنج نہ کرتا۔ جب انگریزوں نے کتّور (جواب کرناٹک میں ہے) کی چھوٹی سی ریاست کو ختم کرنا چاہا تو وہاں کی رانی چنّما نے ہتھیار اٹھا لیے اور انگریز مخالف تحریک کی قیادت کی۔ اسے 1824 میں گرفتار کر لیا گیا اور 1829 میں قید میں ہی اس کی موت ہو گئی۔ لیکن کتّور میں سانگولی کے ایک غریب چوکیدار

شکل 10– لارڈ ہیسٹنگز

نے جس کا نام راینّا تھا تحریک مزاحمت جاری رکھی۔ عوامی تعاون سے اس نے بہت سے برطانوی کیمپ اور ان کی دستاویزات کو تباہ کر دیا۔ انگریزوں نے 1830 میں اسے گرفتار کر کے سولی پر چڑھا دیا۔ بعد میں مقابلہ آرائی کی دوسری کئی تحریکوں کے بارے میں آپ اس کتاب میں پڑھیں گے۔

1830 کے اواخر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو روس کے بارے میں تشویش ہوئی۔ اس کو خیال ہوا کہ ایشیا کے وسطی حصے کو پار کر کے روس شمال مغربی سرحد سے ہندوستان میں داخل نہ ہو جائے اور اس علاقے میں ہمارا اقتدار ختم نہ ہو، اس خیال سے انھوں نے 1838 سے 1842 تک افغانستان سے ایک طویل جنگ کی اور وہاں اپنا اقتدار قائم کرلیا۔ 1843 میں سندھ پر کمپنی کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اس کے بعد پنجاب کی باری تھی لیکن مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وجہ سے کمپنی کو انتظار کرنا پڑا۔ 1839 میں مہاراجہ کی وفات کے بعد سکھوں سے دو جنگیں لڑی گئیں۔ بالآخر 1849 میں پنجاب کا بھی الحاق کرلیا گیا۔

شکل 11- مہاراجہ رنجیت سنگھ کا دربار

محرومی کا اصول

ریاستوں کے الحاق کا عمل گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی (1848 تا 1856) کے دور میں تمام ہوا۔ اس نے ایک نئے اصول کا اعلان کیا جسے محرومی کا اصول (Doctrine of Lapse) کہا جاتا ہے جس کی رو سے اگر کسی ریاست میں وارث کی حیثیت سے اولاد نرینہ نہ ہو تو اس کی ریاستی حیثیت ختم ہو جائے گی۔ دوسرے الفاظ میں وہ کمپنی کے حدودِ مملکت میں شامل کر لی جائے گی۔ اس سادہ اصول کے تحت

سرگرمی

تصور کیجیے کہ آپ کسی نواب کے بھتیجے ہیں اور کسی دن بادشاہ بننے والے ہیں۔ اچانک آپ کو علم ہوتا ہے کہ انگریزوں کے نئے محرومی کے اصول کے تحت آپ کو بادشاہ بننے سے روک دیا گیا ہے۔ اب آپ کے احساسات کیا ہوں گے؟ آپ تاج حاصل کرنے کے لیے کون سی کوششیں عمل میں لائیں گے۔

2019-20
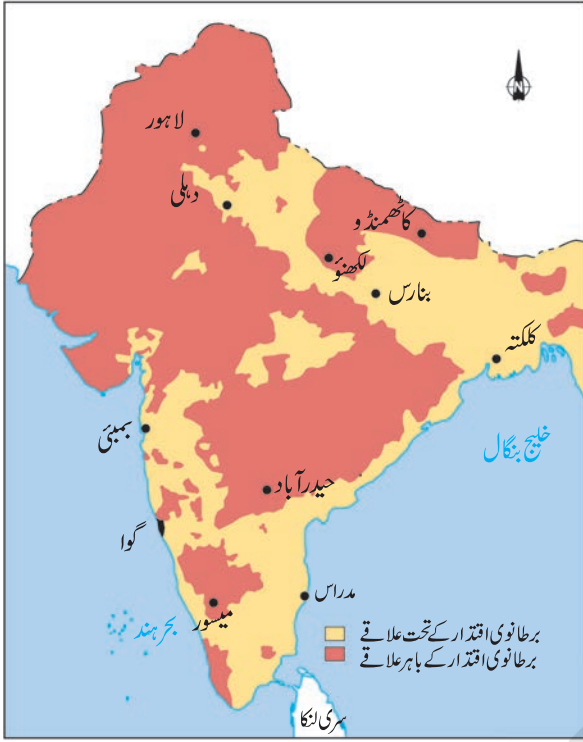
شکل *a* 11 ہندوستان، 1797

شکل *b* 11 ہندوستان، 1840
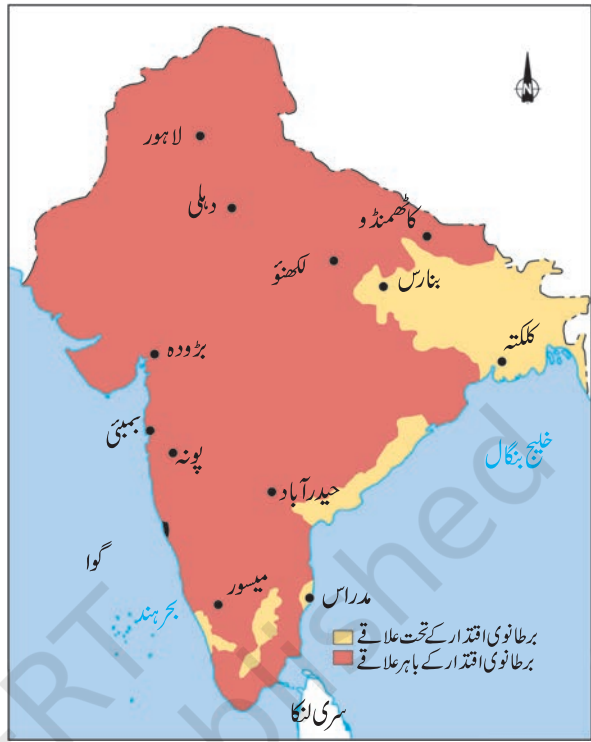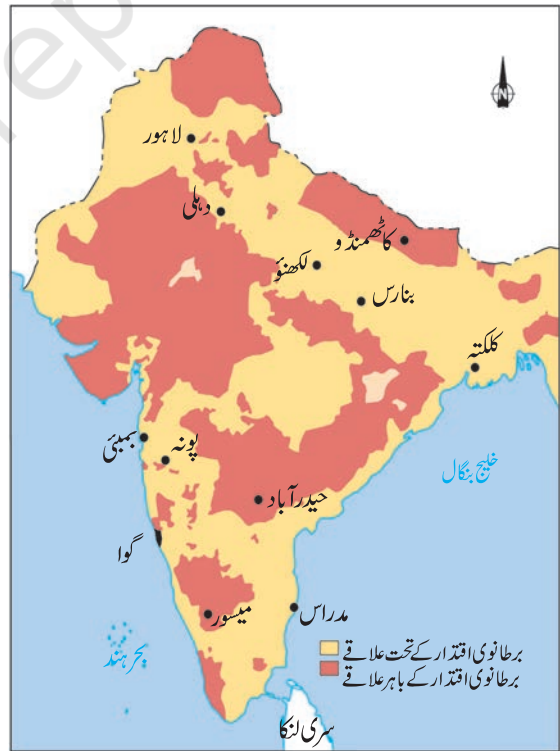
شکل *c* 11 ہندوستان، 1857

شکل 11 a،b،c -ہندوستان میں برطانوی اقتدار کی تدریجی توسیع

ان نقشوں کو دیکھیے اور آج کے ہندوستان کے سیاسی نقشے پر نظر ڈالیے۔ مندرجہ بالا ہر نقشے میں ہندوستان کے ان مقامات پر غور کیجیے جن پر انگریزوں کی حکومت نہیں تھی۔

یکے بعد دیگرے 1848 میں ستارا، 1850 میں سمبل پور، 1852 میں اودے پور، 1853 میں ناگپور اور 1854 میں جھانسی کی ریاستیں بحق کمپنی ضبط ہوگئیں۔

بالآخر 1856 میں کمپنی نے اودھ کو بھی اپنے قبضہ میں لے لیا۔ اس کے لیے انھوں نے مزید دلیل یہ دی کہ نواب کی بدانتظامی سے لوگوں کو نجات دلانے کے لیے کمپنی کے اوپر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ اس پر قبضہ کرلے۔ نواب کے اس شرمناک طریقے سے دست بردار کیے جانے کی وجہ سے اودھ کے عوام مشتعل ہو اٹھے۔ ان کا اشتعال 1857 میں ایک باغیانہ تحریک کی شکل میں پھوٹ پڑا۔

قاضی – جج

مفتی – مسلم قانون داں جس کے فتووں کو قاضی روبہ عمل لاتا ہے۔

مواخذہ – برطانوی دارالعوام میں ثابت شدہ غیر اخلاقی الزامات کی بنیاد پر دارالامرا میں کسی ملزم کے خلاف مقدمہ

نئے انتظامیہ کی تشکیل

وارن ہیسٹنگز جو 1773 سے 1785 تک گورنر جنرل رہا، ہندوستان میں کمپنی کی طاقت میں اضافہ کرنے والوں میں سے ایک اہم فرد تھا۔ اس کے زمانے میں کمپنی نے صرف

شکل 12 - وارن ہیسٹنگز کا مقدمہ۔ مصور: آر۔ جی پولارڈ، 1789

جب وارن ہیسٹنگز 1785 میں انگلینڈ واپس ہوا تو ایڈمنڈ برک نے اس پر ذاتی طور سے بنگال میں بدانتظامی کا الزام عائد کیا جس نے ایک **مواخذے** کی شکل اختیار کی اور جس کی کارروائی برطانوی پارلیمنٹ میں سات سال تک جاری رہی۔

بنگال ہی نہیں بلکہ مدراس اور بمبئی میں بھی اقتدار حاصل کیا۔ یہ برطانوی علاقے علاحدہ علاحدہ انتظامی اکائیوں میں پریسیڈنسی کہلاتے تھے۔ تین پریسیڈنسیاں بنگال، مدراس اور بمبئی تھیں جن کا منتظم اعلیٰ گورنر کہلاتا تھا۔ پوری انتظامیہ کا سربراہ گورنر جنرل ہوتا تھا جس کا مرکز کلکتہ تھا۔ وارن ہیسٹنگز پہلا گورنر جنرل تھا جس نے بہت سی انتظامی اصلاحات خاص طور پر عدلیہ میں رائج کیں۔

1772 سے ایک نیا عدالتی نظام رائج کیا گیا۔ ہر ضلع میں دو طرح کی عدالتیں ہوتی تھیں۔ ایک جرائم کے معاملات کے لیے تھی جسے ''فوجداری عدالت'' کہا جاتا تھا دوسری شہری معاملات کے لیے جسے ''دیوانی عدالت'' کہا جاتا تھا۔ دیوانی عدالتوں کی سربراہی ضلع کلکٹر کیا کرتے تھے جو یوروپی ہوا کرتے تھے۔ ان کی مدد کے لیے ہندوستانی قوانین کی ترجمانی پنڈت اور مولوی کرتے تھے۔ فوجداری عدالتیں ابھی تک **قاضی** اور **مفتی** کے ماتحت تھیں لیکن ان کی نگرانی بھی ضلعی کلکٹر کیا کرتے تھے۔

ایک مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ **دھرم شاستروں** کے مختلف طریق فکر پر مبنی مقامی قوانین کی ترجمانی برہمن پنڈت الگ الگ طریقوں سے کرتے تھے۔ ان میں یکسانیت پیدا کرنے کے لیے 1775 میں گیارہ پنڈتوں کو مامور کیا گیا کہ ہندو قوانین کا ایک مجموعہ تیار کریں۔ این۔ بی۔ ہالہڈ (N.B.Halhed) نے اس مجموعہ قوانین کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا۔ 1778 میں مسلم قوانین کا بھی ایک مجموعہ یوروپی ججوں کی سہولت کی خاطر مرتب کیا گیا۔ 1773 کے ریگولیٹنگ ایکٹ کے تحت ایک نئی عدالت عالیہ قائم کی گئی جب کہ ایک عدالت مرافعہ (کورٹ آف اپیل) — صدر نظامت عدالت — بھی کلکتہ میں قائم کی گئی۔

ہندوستانی ضلع کا سب سے زیادہ با اختیار فرد کلکٹر ہوتا تھا۔ جیسا کہ اس نام سے ظاہر ہے اس کا کام مالیات اور ٹیکسوں کا جمع کرنا، اور ججوں نیز پولیس آفیسروں اور داروغہ کی امداد سے امن و امان قائم رکھنا تھا۔ اب اس کا دفتر — کلکٹریٹ — طاقت اور سرپرستیوں کا مرکز بن گیا جس نے پرانے اقتدار رکھنے والوں کی جگہ لی۔

کمپنی کی فوج

نو آبادیاتی حکومت ہندوستان میں نئے انتظامی اور اصلاحی خیالات لے کر آئی لیکن اس کی

ماخذ 5

''میں ایک عوام دشمن اور سبھوں کو کچلنے والے فرد کی سرزنش کرتا ہوں''

یہ ایڈمنڈ برک کی تقریر کا اقتباس ہے جو اس نے وارن ہیسٹنگز کے خلاف مواخذے کی ابتدا کرتے ہوئے کی تھی:

میں ہندوستانی عوام کے نام پر جن کے حقوق کو اس شخص نے پاؤں تلے کچلا اور جن کے ملک کو اس نے ریگستان میں تبدیل کر دیا۔ آخر میں فطرت انسانی اور مرد و زن کے نام پر ہر عمر، تمام عہدہ جات کے نام پر میں اس عوام دشمن اور سبھوں کو کچلنے والے کی سرزنش کرتا ہوں۔

دھرم شاستر — سنسکرت میں اخلاقیات پر مشتمل سماجی قوانین جنھیں 500 ق م اور اس کے بعد کے دور میں مدون کیا گیا۔

مسکٹ — وزنی بندوق جسے پیدل فوجی استعمال کرتے تھے۔

سوار — گھوڑسوار

میچ لاک — ابتدائی بندوق جس میں بارود بھر کر دیا سلائی دکھائی جاتی تھی۔ توڑے دار بندوق

شکل 13– بنگال کا ایک فوجی سوار کمپنی کی ملازمت میں، مصور نا معلوم ہندوستانی، 1780
مراٹھوں اور میسور کی جنگوں کے بعد کمپنی نے سوار فوج کی اہمیت کو محسوس کیا۔

قوت کا دارومدار فوجی طاقت پر تھا۔ مغلوں کی فوج سواروں اور پیدل فوجیوں پر مشتمل تھی۔ انھیں تیراندازی اور تلوار چلانے کی مشق کرائی جاتی تھی۔ فوج میں سواروں کا غلبہ ہوتا تھا اور مغل ریاستیں بڑی تربیت یافتہ اور پیشہ ور پیدل فوج کی ضرورت محسوس نہیں کرتی تھیں۔ دیہاتوں میں کسان ہتھیار بند ہوتے تھے اور مقامی زمیندار مغلوں کو پیدل فوج کی فراہمی کیا کرتے تھے۔

اٹھارھویں صدی میں ایک تبدیلی یہ واقع ہوئی کہ اودھ اور بنارس کی ریاستوں نے فوج میں کسانوں کی بھرتی شروع کردی اور انھیں پیشہ ورانہ فوجی تربیت دینی شروع کردی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے بھی یہی طریقہ اپنایا۔ اپنی فوج کے لیے بھرتی شروع کی جسے بعد میں سیپوئے آرمی (Sepoy army) یعنی سپاہیوں کی فوج کا نام دیا گیا۔

1820 سے جنگی طریقے تبدیل ہو جانے کی وجہ سے کمپنی میں سوار فوجیوں کی ضرورت زوال پذیر ہوگئی۔ یہ اس لیے ہوا کہ اس وقت برطانیہ کی حکومت برما، افغانستان اور مصر میں مصروفِ جنگ تھی جہاں فوجی عام بندوقوں (Muskets) اور توڑے دار بندوقوں (Matchlocks) سے مسلح تھے۔ کمپنی کی فوجوں کو تبدیل ہوتی ہوئی فوجی ضرورتوں کا ساتھ دینا پڑا اور اس طرح پیدل فوجی دستوں نے اہمیت حاصل کرلی۔

انیسویں صدی کے آغاز میں برطانیہ نے یکساں فوجی طریقے اختیار کرنے کی ابتدا

کی۔ انھوں نے فوجیوں کی یوروپی طریق جنگ کی تربیت اورنظم وضبط میں اضافے کیے جس کی وجہ سے ان کی زندگیاں پہلے کے مقابلہ میں بہتر طور سے منظّم ہوگئیں۔ اکثر مسائل بھی پیدا ہوتے رہے کیوں کہ پیشہ ورانہ فوج کی اس تربیت میں ذات پات اور فرقہ وارانہ جذبات کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ لیکن کیا لوگ آسانی سے ذات پات کے احساس اور فرقہ وارانہ جذبات کو چھوڑ سکتے تھے؟ کیا وہ اپنے کو صرف ایک سپاہی سمجھنے پر تیار ہو سکتے تھے جن کا اپنی برادری سے کوئی تعلق نہ ہو۔

فوجی سپاہی کیا محسوس کرتے تھے؟ اپنی زندگیوں اور تشخص کی تبدیلیوں پر ان کا ردعمل کیا ہو رہا تھا۔ یعنی یہ کہ وہ کیا تھے اور اب کیا ہیں۔ 1857 کا انقلاب سپاہیوں کی دنیا میں اس تبدیلی کی کچھ جھلک دکھاتا ہے۔ آپ اس بغاوت کے بارے میں پانچویں باب میں پڑھیں گے۔

ماحصل

اس طرح ایسٹ انڈیا کمپنی ایک تجارتی کمپنی سے تبدیل ہو کر ایک نوآبادیاتی طاقت میں تبدیل ہوگئی۔ انیسویں صدی کی ابتدا میں دخانی قوت کی دریافت کے بعد اس میں اور تیزی آئی۔ اس وقت تک ہندوستان تک کے بحری سفر کے لیے چھ سے آٹھ مہینے درکار ہوتے تھے۔ دخانی انجنوں نے اس سفر کو مختصر کر کے تین ہفتوں میں سمیٹ دیا جس کی وجہ سے برطانویوں کو اپنے اہل خانہ کو ایک دور افتادہ ملک ہندوستان لانے میں سہولت ہوگئی۔

1857 تک برصغیر ہندوستان کی 63 فیصد زمین اور 78 فیصد عوام پر کمپنی کا براہ راست حاکمانہ اقتدار قائم ہوگیا۔ اس کا بالواسطہ اثر پورے ملک کی آبادی اور رقبے پر پڑا۔ اب ایسٹ انڈیا کمپنی عملاً پورے ہندوستان کی حاکم بن چکی تھی۔

کہیں اور

جنوبی افریقہ میں غلاموں کی تجارت

ہالینڈ کے تجارتی جہاز سترھویں صدی میں جنوبی افریقہ پہنچے۔ جلد ہی وہاں غلاموں کی تجارت شروع ہوگئی۔ لوگوں کو پکڑ کر زنجیروں میں جکڑ دیا جاتا اور غلاموں کے بازار میں بیچ دیا جاتا تھا۔ 1834 میں جب غلامی کا خاتمہ ہوا تو جنوبی افریقہ کے کیپ (ٹاؤن) میں 36774 کی تعداد میں غلام لوگوں کے قبضے میں تھے۔

1824 میں کیپ (ٹاؤن) کی سیاحت کرنے والے ایک شخص نے غلاموں کی نیلامی کے بازار میں جو دلخراش منظر دیکھا اسی کی زبان سے سنیے:

یہ معلوم ہونے کے بعد کہ مویشیوں اور فارم کی ضروریات وغیرہ کا نیلام ہونے والا ہے......... ہم نے کچھ نئے بیل خریدنے کے لیے اپنی ویگن روکی۔ جانوروں کے ساتھ .... ایک عورت اور اس کے تین بچے تھے۔ کسانوں نے ان کا اس طرح معائنہ کیا گویا وہ بھی جانور ہوں۔ انھیں الگ الگ مختلف گاہکوں کو فروخت کیا گیا۔ آنسو، وحشت اور اذیت جو ماں کو تھی اس کی بچوں پر دلدوز نگاہیں اور غریب بچوں کی معصوم دردناک اور افسوسناک کیفیت جب کہ وہ اپنی جدا ہونے والی ماں سے چمٹے جا رہے تھے .... اس کے بالمقابل انسانی احساس سے عاری مسکراتے ہوئے ناظرین کے چہرے، افسوس!

نگل ورڈن کی تصنیف دی چین دیٹ بائنڈاس: اے ہسٹری آف سلیوری ایٹ دی کیپ، 1996 کا اقتباس

دوہرائیے

1. جوڑیاں ملائیے

دیوانی	ٹیپو سلطان
شیر میسور	زمین کا لگان وصول کرنے کا حق
فوجداری عدالت	سیپوئے
رانی چنّما	کریمنل کورٹ
سپاہی	کِٹّور میں برطانیہ کے خلاف تحریک کی قیادت کی

2. خالی جگہ پر کیجیے:

(a) برطانوی فتوحات کی ابتدا بنگال میں........................ کی جنگ سے ہوئی۔

(b) حیدرعلی اور ٹیپو سلطان........................ کے حکمراں تھے۔

(c) ڈلہوزی نے اصول........................ نافذ کیا۔

(d) مراٹھا حکومتیں خصوصی طور سے ہندوستان........................ حصے میں واقع تھیں۔

3. بتائیے صحیح ہے یا غلط:

(a) مغل سلطنت اٹھارھویں صدی میں زیادہ طاقتور ہوگئی۔

(b) برطانیہ کی ایسٹ انڈیا کمپنی واحد یوروپی کمپنی تھی جس نے ہندوستان سے تجارت کی۔

(c) مہاراجہ رنجیت سنگھ پنجاب کا حکمراں تھا۔

(d) برطانیہ نے مفتوحہ علاقوں میں انتظامی اصلاحات نافذ نہیں کیں۔

تصور کیجیے

آپ انگلینڈ میں اٹھارھویں صدی کے اواخر یا انیسویں صدی کے اوائل میں رہ رہے ہیں۔ برطانوی فتوحات کے افسانے سن کر آپ کا کیا ردعمل ہوگا؟ خیال رہے کہ آپ یہ پڑھ چکے ہیں کہ اس وقت بہت سے اہل کاروں نے بے اندازہ دولت کے ذخیروں سے اپنا گھر بھرلیا تھا۔

گفتگو کیجیے

4. یوروپ کی تجارتی کمپنیوں میں کس چیز نے ہندوستان میں دلچسپی پیدا کی؟

5. بنگال کے نوابوں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے درمیان کن مسائل پر اختلاف تھا؟

6. دیوانی کے حقوق نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو کیسے فائدہ پہنچایا؟

7. ''عہدمعاونت'' کی تشریح کیجیے۔

8. ہندوستانی حکمرانوں اور کمپنی کے درمیان انتظامی امور میں کیا فرق تھا؟

9. کمپنی کی فوج کی تشکیل میں جو تبدیلیاں واقع ہوئیں انھیں بیان کیجیے۔

کر کے دیکھیے

10. برطانیہ کے بنگال کو فتح کر لینے کے بعد کلکتہ ایک چھوٹے سے گاؤں سے ترقی کر کے ایک بڑا شہر بن گیا۔ نو آبادیاتی دور میں یوروپین اور ہندوستانیوں کے طرز زندگی، تمدن اور تعمیرات کا حال معلوم کیجیے۔

11. مندرجہ ذیل میں سے کسی ایک کے بارے میں تصویریں، قصے، نظمیں اور معلومات جمع کیجیے۔ جھانسی کی رانی، مہادجی سندھیا، حیدرعلی، مہاراجہ رنجیت سنگھ، لارڈ ڈلہوزی یا آپ کے علاقے میں اس زمانے کا کوئی حکمراں۔

3 دیہی علاقوں پر حکومت

شکل 1 – رابرٹ کلائیو مغل شہنشاہ سے 1765 میں بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی کا فرمان حاصل کرتے ہوئے۔

کمپنی دیوان بنتی ہے

12 اگست 1765 کو مغل شہنشاہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو بنگال کا دیوان مقرر کیا۔ یہ کام درحقیقت لارڈ کلائیو کے خیمے میں کچھ انگریزوں اور ہندوستانیوں کی گواہی کے ساتھ ہوا لیکن اوپر جو تصویر دی گئی ہے اس میں دکھایا گیا ہے کہ یہ کام بڑی شان وشوکت سے شاہی ماحول میں انجام دیا گیا۔ مصور کو یہ کام سونپا گیا تھا کہ کلائیو کی زندگی کے واقعات کو یادگار طریقے سے نمایاں کرے۔ دیوانی کا حصول انگریزوں کے لیے واضح طور سے ایک اہم واقعہ تھا۔

دیوان کی حیثیت سے کمپنی نے اپنے محدود اختیار میں سب سے بڑے مالی منتظم کی حیثیت پائی تھی۔ اب اسے کلی طور سے انتظامیہ اور اپنے مالی وسائل کو مستحکم بنانا تھا۔ یہ کام اسے اس طور پر انجام دینا تھا کہ

اپنے بڑھتے ہوئے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے اسے وافر مقدار میں مالیہ حاصل ہو سکے۔ اسے اس بات کو بھی یقینی بنانا تھا کہ ایک تجارتی کمپنی کی حیثیت سے اپنی ضرورت کی اشیا خرید سکے اور اپنی مرضی سے جو چاہے فروخت کر سکے۔

وقت گزرنے کے ساتھ کمپنی کو احساس ہوا کہ اسے احتیاط کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیے۔ بیرونی طاقت ہونے کی وجہ سے اسے ان لوگوں کو بھی مطمئن رکھنا تھا جنھوں نے ماضی میں اس ملک پر حکومت کی تھی، جنھیں یہاں اختیار اور عزت حاصل تھی اور جنھیں مکمل طور پر ختم نہیں کیا جا سکا تھا۔

پھر یہ کیسے ہو؟ اس باب میں ہم دیکھیں گے کہ کمپنی نے کیسے دیہی علاقوں میں اپنی نوآبادی قائم کی، محاصل کی تنظیم کی، لوگوں کے حقوق نئے سرے سے متعین کیے اور وہی فصلیں اگائیں جو وہ چاہتی تھی۔

کمپنی کی مالیات

کمپنی کو دیوانی حاصل ہو گئی تھی لیکن وہ ابھی تک اپنے کو ایک تاجر سمجھتی تھی۔ آمدنی میں اضافہ تو بے شک وہ چاہتی تھی لیکن اس کی وصولی اور اس کے حسابات کی نگہداشت کا کوئی نظم نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کی کوشش رہتی تھی کہ اتنے روپیے وصول ہو جائیں جس سے وہ حسب خواہش عمدہ کپاس اور ریشمی کپڑا سستے داموں پر حاصل کر سکے۔ پانچ ہی برسوں میں بنگال میں خریدی ہوئی اشیا کی قیمت دوگنی ہو گئی۔ 1865 سے پہلے کمپنی کو اشیا کی خریداری کے لیے سونا اور چاندی برطانیہ سے درآمد کرنا پڑتا تھا۔ اب بنگال کے محاصل کی وجہ سے وہ یہاں کی اشیا کی برآمد پر قادر ہو گئی۔

شکل 2 – مرشدآباد (بنگال) میں ایک ہفتہ واری بازار۔

دیہاتوں کے کاشت کار اور دستکاران ہفتہ واری بازاروں (ہاٹ) میں اپنا مال فروخت کرنے اور ضرورت کی اشیا خریدنے کے لیے برابر آتے تھے۔ اقتصادی بحران کے زمانے میں ان بازاروں پر بہت برا اثر پڑا۔
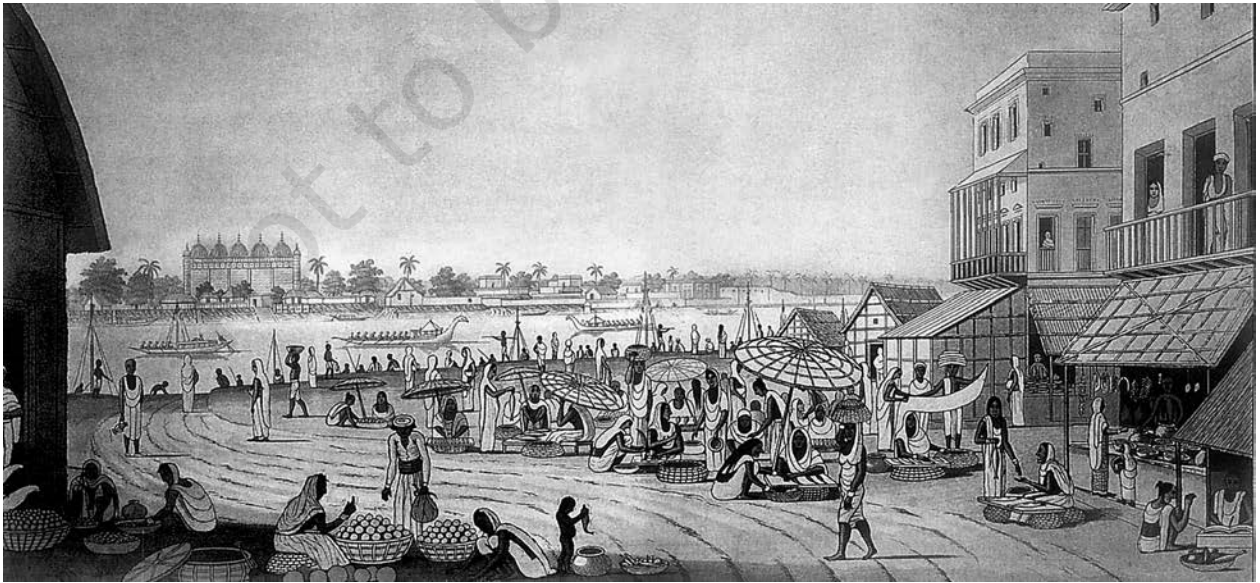
جلد ہی یہ واضح ہوگیا کہ بنگال کی معیشت زبردست بحران کا شکار ہو چکی ہے۔ دستکار دیہاتوں سے اپنے مکانات چھوڑ کر بھاگ رہے تھے کیوں کہ انھیں اپنی مصنوعات کوڑیوں کے مول کمپنی کو فروخت کرنی پڑتی تھیں۔ کاشت کار لگان کے مطالبات کو پورا کرنے سے قاصر تھے۔ صنعتیں زوال پذیر تھیں اور زراعت ختم ہوتی جارہی تھی۔ تب ہی 1770 میں ایک زبردست قحط نے بنگال میں ایک کروڑ انسانوں کو نگل لیا۔ آبادی کا ایک تہائی حصہ صاف ہوگیا۔

شکل 3 – چارلس کارنوالس

کارنوالس اس زمانہ میں ہندوستان کا گورنر جنرل تھا جب کمپنی نے دائمی بندوبست (Permanent Settlement) کی اسکیم نافذ کی تھی۔

زراعت میں اصلاح کی ضرورت

اگر معیشت تباہ ہو رہی ہو تو کیا کمپنی کی آمدنی جاری رہ سکتی تھی؟ کمپنی کے بہت سے عہدے داروں نے محسوس کیا کہ زمین میں سرمایہ کاری اور کاشت کاری کی حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے۔

پھر یہ کام کیسے ہو؟ اس سوال پر دو دہائیوں کی بحث و تکرار کے بعد بالآخر کمپنی نے 1793 میں دائمی بندوبست (Permanent Settlement) کا طریقہ اپنایا۔ اس طریقے کی رو سے راجاؤں اور تعلقہ داروں کو زمیندار کی حیثیت سے تسلیم کرلیا گیا۔ انھیں کاشت کاروں سے لگان وصول کرنے اور کمپنی کو مالیہ فراہم کرنے کی ذمہ داری دے دی گئی۔ یہ رقم اس طرح سے مستقلاً متعین کردی گئی کہ آئندہ اس میں کوئی اضافہ نہیں کیا جائے گا۔ یہ محسوس کیا گیا کہ اس سے ایک طرف تو کمپنی کے خزانہ میں مالیہ کی آمد جاری رہے گی اور دوسری طرف زمینداروں کو ان کی زمینوں کی اصلاح کے لیے روپیے خرچ کرنے کی ہمت افزائی ہوگی۔ چوں کہ کمپنی کا مالیہ متعین کر دیا گیا ہے اس لیے پیداوار میں اضافہ کی زائد آمدنی سے زمیندار فائدہ اٹھا سکیں گے۔

مسئلہ

اس دائمی بندوبست نے بالآخر مسائل پیدا کر دیے۔ کمپنی کے ذمہ داروں پر جلد ہی واضح ہوگیا کہ زمیندار زمینوں پر سرمایہ کاری نہیں کر رہے ہیں۔ ان پر جو مالیہ عائد کیا گیا تھا وہ اتنا

سرگرمی

آپ یہ کیوں محسوس کرتے ہیں کہ کول بروک کو بنگال میں ماتحت کاشت کاروں کی پریشانیوں سے دلچسپی تھی؟ پچھلے صفحات کا مطالعہ کیجیے اور اس کے ممکنہ اسباب بیان کیجیے۔

ماخذ 1

کول بروک بنگال کے کسانوں (رعیت) کے بارے میں

بنگال کے بہت سے دیہات میں طاقت ور مزارع (زمیندار) خود کاشت نہیں کرتے تھے بلکہ کاشت کاروں کو بہت زیادہ کرایہ (بٹائی) پر زمین دے دیتے تھے۔ ایچ۔ ٹی۔ کول بروک 1806 میں ان زیردست کسانوں کا حال بیان کرتا ہے:

یہ زیردست کاشت کار بھاری لگان اور سود پر لیے، قرض جانور، بیج اور دوسری ضروریات کی ادائیگی سے پوری زندگی عہدہ برآ نہیں ہو پاتے تھے۔ اس تباہ حالی کے سبب چوں کہ حالات کی بہتری سے وہ ناامید تھے اس لیے وہ دل جمعی سے کام نہیں کر سکتے تھے۔

زیادہ تھا کہ زمیندار اس کی ادائیگی سے قاصر تھے۔ ادھر حال یہ تھا کہ جو محاصل ادا نہیں کرتا تھا اس سے زمینداری ضبط کر لی جاتی تھی۔ بہت سی زمینداریاں کمپنی نے نیلام کیں۔

انیسویں صدی کی پہلی دہائی میں صورت حال میں تبدیلی آئی۔ بازار میں قیمتیں بڑھیں اور زراعت میں بتدریج ترقی ہوئی۔ اس سے زمینداروں کو تو فائدہ ہوا لیکن کمپنی کو کوئی نفع نہیں ہوا کیوں کہ دائمی بندوبست کی وجہ سے وہ اس مالیہ میں اضافہ کا مطالبہ نہیں کر سکتی تھی۔

اس کے باوجود زمیندار کاشت کاری کو فروغ دینے میں دلچسپی لینے پر آمادہ نہیں تھے۔ کچھ تو پہلے ہی اس بندوبست کے تحت اپنی زمین کھو چکے تھے اور کچھ یہ محسوس کر رہے تھے کہ سرمایے اور محنت کے بغیر بھی دولت کمائی جا سکتی ہے۔ جب تک زمینداروں کو کسانوں کو زمین کرایے پر دینے کا حق نہ ہو انھیں زمینوں کی اصلاح سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

دوسری طرف کسان بھی اس طریقے کو بہت ظالمانہ سمجھتے تھے۔ کیوں کہ زمیندار کو بہت زیادہ کرایہ ادا کرنے کے باوجود ان کی زمینیں غیر محفوظ تھیں۔ لگان ادا کرنے کے لیے اکثر انھیں ساہوکاروں سے قرض لینا پڑتا تھا اور اس قرض کی ادائیگی نہ کرنے پر اپنی پشتینی زمینوں سے انھیں ہمیشہ کے لیے ہاتھ دھونے پڑ جاتے تھے۔

نیا طریقۂ کار

انیسویں صدی کی ابتدا تک کمپنی کے بہت سے ذمہ داروں نے طے کر لیا کہ محاصل کی وصولی کا طریقۂ کار دوبارہ تبدیل ہونا چاہیے۔ کوئی مخصوص رقم کیسے متعین کی جا سکتی تھی جب کہ کمپنی کو اپنے انتظامی اخراجات اور تجارت کی بحالی کے لیے زیادہ رقم کی ضرورت ہو؟

محال – برطانیہ کے محاصل کی دستاویزات میں ''محال'' گاؤں یا گاؤں کے ایک مجموعہ کو کہا جاتا تھا جسے محاصل کے ایک قطعے کی حیثیت حاصل تھی۔

شمال مغربی بنگال پریسیڈنسی کے اضلاع (اس کا بڑا حصہ اب اتر پردیش ہے) میں ایک انگریز ہولٹ میکنزی نے ایک نیا طریقہ ایجاد کیا جسے 1822 میں نافذ کیا گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ شمالی ہندوستان میں دیہات ایک اہم سماجی اکائی ہے جس کا تحفظ کیا جانا چاہیے۔ اس کا مشورہ یہ تھا کہ کلکٹر ایک ایک گاؤں کا دورہ کرے، کھیتوں کی پیمائش کرے اور مختلف گروہوں کی رسوم اور ان کے حقوق کو ضبطِ تحریر میں لائے۔ ہر گاؤں میں وصول ہونے والے محاصل کا تخمینہ کئی دیہاتوں پر مشتمل محال (Mahal) پر عائد کی جانے والی مال گذاری

کا حساب لگانے میں معاون ہوگا۔ یہ مطالبہ دوامی نہیں ہوگا بلکہ وقتاً فوقتاً اس پر نظرثانی کی جاسکے گی۔ گاؤں کا مکھیا نہ کہ زمیندار اِس کی وصولی اور کمپنی تک پہنچانے کا ذمہ دار ہوگا۔ اس کو محال واری (Mahalwari) بندوبست کا نام دیا گیا۔

مُنرو کا طریقہ (The Munro System)

جنوبی ہندوستان میں بھی دائمی بندوبست سے الگ ہٹ کر ایک ایسا ہی اقدام زیرغور تھا۔ اس طریقہ کو رعیت واری (ryotwari) کا نام دیا گیا۔ ٹیپو سلطان سے جنگ ختم ہونے کے بعد اس طریقے کو کیپٹن الگزنڈر ریڈ نے کچھ مفتوحہ علاقوں میں مختصر طور پر آزمایا۔ بعدازاں اس کی توسیع کرتے ہوئے ٹامس منرو نے بتدریج اسے پورے جنوبی ہندوستان میں نافذ کردیا۔

ریڈ اور مُنرو دونوں نے سمجھ لیا تھا کہ جنوبی ہندوستان میں روایتی زمینداری کا رواج نہیں تھا اس لیے ان کی دلیل تھی کہ بندوبست کو براہ راست کسانوں سے وابستہ ہونا چاہیے جو آبائی طور سے اس زمین پر محنت کرتے آئے ہیں۔ لگان کا تخمینہ لگانے سے پہلے زمین کا الگ الگ سروے (معائنہ) کر لینا چاہیے۔ منرو کا خیال تھا کہ انگریزوں کو اپنی زیردست رعیت کے ساتھ حقیقی باپ کا سا سلوک کرنا چاہیے۔

سبھی کچھ اچھا نہیں تھا

نئے طریقے کے جبراً نفاذ کے چند برسوں کے بعد ہی پتہ چل گیا کہ اس میں سب کچھ اچھا نہیں تھا۔ زمین سے زیادہ سے زیادہ آمدنی حاصل کرنے کی حرص میں مال گذاری وصول کرنے والوں نے اپنے مطالبات بہت زیادہ بڑھا دیے۔ کسان ان مطالبات کو پورا نہیں کر سکے۔ وہ گاؤں سے بھاگ کھڑے ہوئے اور بہت سے علاقوں میں گاؤں کے گاؤں خالی ہو گئے۔ نئے سسٹم کو نافذ کرنے والے پُر امید افسروں نے سمجھا تھا کہ یہ سسٹم کسانوں کو دولت مند بنادے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔

یوروپ کے لیے غلّہ

انگریز نہ صرف یہ سمجھتے تھے کہ دیہات سے انھیں مالیہ حاصل ہوگا بلکہ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ وہ یہاں سے یوروپ کی ضرورت کا غلہ بھی حاصل کرسکیں گے۔ اٹھارھویں صدی کے آخر تک

شکل 4 – ٹامس منرو، مدراس کا گورنر (1819 تا 1826)

سرگرمی

فرض کیجیے کہ آپ کو کمپنی کے ایک نمائندے کی حیثیت سے کمپنی کے زیراقتدار دیہاتی علاقوں کے بارے میں ایک رپورٹ انگلینڈ بھیجنی ہے۔ آپ اس رپورٹ میں کیا لکھیں گے؟

2019-20

کمپنی کی یہ کوشش رہی کہ افیون اور نیل (Indigo) کی کاشت میں اضافہ ہو۔ اس صدی اور اس کے بعد آنے والی صدی کے نصف تک کمپنی ہندوستان کے مختلف علاقوں کو نہ صرف آمادہ کرتی رہی بلکہ مجبور کرتی رہی کہ وہ علاقائی بنیاد پر الگ الگ چیزوں کی کاشت کریں۔ بنگال میں جوٹ، آسام میں چائے، صوبہ متحدہ (موجودہ اتر پردیش) میں گنا، پنجاب میں گیہوں، مہاراشٹر اور پنجاب میں کپاس اور مدراس میں چاول۔

یہ سب کیسے ہوا؟ انگریزوں نے اپنی ضرورت کی اشیا کی پیداوار کے لیے مختلف طریقے آزمائے۔ آیئے ہم ذرا قریب سے ایسی ہی ایک فصل کے اگائے جانے کی کہانی کا مطالعہ کریں۔

شکل 5 – قلم کاری کا نقش، بیسویں صدی میں ہندوستان

شکل 6 – مورِس کا سوتی نقش، انیسویں صدی کے اواخر میں انگلینڈ

کیا رنگوں کی بھی تاریخ ہے؟

شکل 5 اور 6 کو دیکھیے۔ شکل 5 (دائیں جانب) ہندوستان میں آندھرا پردیش کے بنکروں کا تیار کردہ قلم کاری نقش ہے۔ شکل 6 (بائیں جانب) برطانیہ کے انیسویں صدی کے معروف شاعر اور آرٹسٹ ولیم موریس کا تیار کردہ پھولوں کا نقش ہے۔ دونوں میں ایک چیز مشترک ہے، وہ ہے گہرا نیلا رنگ، جسے عام طور سے ''نیل'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ یہ رنگ کیسے تیار کیا جاتا تھا؟

یہ نیلا رنگ جو آپ نقوش میں دیکھ رہے ہیں ایک پودے سے تیار کیا جاتا ہے جس کا نام نیل ہے۔ اس بات کے قوی امکانات ہیں کہ انیسویں صدی میں موریس نے اپنی نقاشی میں جو نیلا رنگ برطانیہ میں استعمال کیا تھا ہندوستان میں پیدا ہونے والے پودے نیل سے تیار شدہ اور برآمد کردہ ہوگا کیوں کہ ہندوستان اس نیلے رنگ کو پوری دنیا کو برآمد کرنے والا سب سے بڑا ملک تھا۔

شجر کاری — پیداوار کرنے والے بڑے فارموں (قطعات زمین) کے مالک مختلف طریقوں سے جبری محنت (بیگار) لیتے تھے۔ یہ شجر کاری کافی، گنا، تمباکو، چائے اور کپاس کی پیداوار سے متعلق تھی۔

ہندوستانی نیل کی مانگ کیوں؟

نیل کی پیداوار اصلاً استوائی منطقے (خط سرطان اور خط جدی کے درمیانی جغرافیائی خطے) میں ہوتی ہے۔ تیرھویں صدی کے اطراف میں اٹلی، فرانس اور برطانیہ میں ہندوستانی نیل کی کھپت کپڑے تیار کرنے والوں فروشوں کے یہاں بہت تھی۔ وہ اسے کپڑا رنگنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔

لیکن ہندوستانی نیل کے یوروپی بازاروں میں پہنچنے کی مقدار بہت کم تھی اس لیے اس کے دام بہت اونچے تھے۔ اس وجہ سے وہاں کپڑے کے صنعت کار ایک دوسرے پودے سے جس کا نام ووڈ (Woad) ہے نیلا اور بنفشی رنگ تیار کرنے کا کام لیتے تھے۔ منطقہ معتدلہ (Temperate zone) میں کاشت ہونے کی وجہ سے یوروپ والوں کے لیے اسے حاصل کرنا آسان تھا۔ اس کا پودا شمالی اٹلی، جنوبی فرانس اور جرمنی نیز برطانیہ میں اگایا جاتا تھا۔ نیل سے مقابلہ آرائی کی وجہ سے ووڈ اگانے والوں نے یورپ کی حکومتوں پر دباؤ ڈالا کہ وہ نیل کی درآمد پر پابندی لگا دیں۔

لیکن کپڑا رنگنے والے نیل کے استعمال کو ترجیح دیتے تھے کیوں کہ نیل کا رنگ شوخ نیلا اور ووڈ کا رنگ زرد اور پھیکا ہوتا تھا۔ سترھویں صدی کے آتے آتے یوروپ کے کپڑے کے صنعت کاروں نے اپنی حکومتوں پر نیل کی درآمد پر پابندی کم کرنے کے لیے دباؤ ڈالا۔ فرانسیسیوں نے جزائر کیریبین میں اسپینیوں نے وینیز ویلا میں، پرتگالیوں نے برازیل میں، اور انگریزوں نے جمیکا میں نیل کی کاشت شروع کر دی۔ نیل کی کاشت شمالی امریکہ کے کچھ حصوں میں بھی کی جانے لگی۔

اٹھارھویں صدی کے آخر تک ہندوستانی نیل کی مانگ اور بڑھ گئی۔ برطانیہ میں صنعت کاری میں اضافہ ہو رہا تھا اور کپاس کی پیداوار اچانک بہت آگے پہنچ گئی تھی جس کی وجہ سے کپڑوں کو رنگنے کے لیے نیل کی نئی مانگ شروع ہو گئی۔ ایک طرف اس کی مانگ میں اضافہ ہوا لیکن دوسری طرف مختلف اسباب سے جزائر غرب الہند (West Indies) اور امریکہ سے نیل کی سپلائی موت کے دہانے پر پہونچ گئی۔ 1783 اور 1789 کے درمیان دنیا میں نیل کی پیداوار آدھی رہ گئی۔ برطانیہ کے رنگ ریز نیل حاصل کرنے کے

2019-20

لیے نئے ذرائع کی تلاش میں لگ گئے۔

پھر یہ نیل کہاں سے حاصل ہو؟

برطانیہ ہندوستان کی طرف مڑتا ہے

یورپ میں نیل کی مانگ میں اضافے کی وجہ سے کمپنی ہندوستان میں نیل کی کاشت کے لیے رقبے میں اضافہ کرنے کی تدبیریں سوچنے لگی۔

اٹھارھویں صدی کی آخری دہائیوں میں بنگال میں نیل کی پیداوار میں بہت تیزی سے اضافہ ہوا اور یہ عالمی بازار پر چھا گئی۔ 1788 میں برطانیہ میں درآمد کی جانے والی نیل کی مقدار 30 فیصد تھی۔ 1810 تک یہ تناسب 95 فیصد تک پہنچ گیا۔

شکل 7– غلاموں کی بغاوت سینٹ ڈومنگ، اگست 1791، مصور جنوری اسکیو ہوڈولسکی

اٹھارہویں صدی میں فرانسیسی کاشت کاروں نے کریبین جزائر میں فرانسیسی نوآبادی سینٹ ڈومنگ میں نیل اور گنے کی کاشت شروع کی۔ افریقی غلاموں نے جوان کھیتوں میں کام کرتے تھے 1791 میں بغاوت کردی اور کاشتکاروں کو قتل کردیا۔ 1792 میں فرانس نے اپنی نوآبادیوں میں غلامی کا خاتمہ کردیا اوران واقعات کی وجہ سے کیریبین جزائیر میں نیل کی کاشت میں کمی آگئی۔

نیل کی تجارت کے بڑھتے ہی تاجروں کے کارندے اور کمپنی کے اہل کار نیل کی پیداوار میں سرمایہ کاری کرنے لگے۔ بعد میں کمپنی کے بہت سے اہل کاروں نے ملازمت ترک کردی اور نیل کی تجارت میں لگ گئے۔ زیادہ نفع کے لالچ میں بہت سے انگریز اور اسکاٹ لینڈ کے افراد نیل کی پیداوار میں حصہ لینے کے لیے ہندوستان آگئے۔ جن کے پاس نیل کی کاشت کے لیے سرمایہ نہیں تھا انھیں کمپنی قرض دیتی تھی اور وہ بینک بھی جو اس وقت یہاں قدم جمارہے تھے انھیں قرض کی سہولت فراہم کرتے تھے۔

نیل کی کاشت کے طریقے

نیل کی کاشت کے دو طریقے تھے۔ ایک ''نج'' دوسرے ''ریعتی''۔ نج کاشت میں شجرکار براہ راست اپنی زیرتصرف زمین میں کاشت کرتا تھا۔ یا پھر وہ زمین خریدتا یا کرایہ پر حاصل کرتا تھا اوراُجرت پر مزدوروں سے کام لیتا تھا۔

غلام – اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی دوسرے شخص کی ملکیت میں ہو۔ غلام اپنی مرضی کا مالک نہیں ہوتا بلکہ اپنے مالک کے لیے کام کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔

نج کاشت کاری کے مسائل

ایسے کاشت کاروں کے لیے نج کاشت کاری (Nij cultivation) میں اپنے

2019-20

زیرِ کاشت رقبے کو بڑھانا مشکل تھا۔ نیل صرف زرخیز زمین میں پیدا ہوتا تھا اور ایسی آراضی میں انسانی آبادی بہت گھنی تھی۔ دور دراز علاقے میں بکھرے ہوئے زمین کے صرف چھوٹے قطعات قابل حصول ہوتے تھے۔ شجرکار اس کی یکجا کاشت کے لیے بڑے بڑے قطعات کے طالب تھے۔ یہ زمین آخر انھیں کہاں مل سکتی تھی؟ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ نیل کی فیکٹریوں کے پاس کی زمینوں پر دوسروں کو بے دخل کر کے زبردستی قبضہ جمائیں لیکن اس میں تناؤ اور فساد ہو جایا کرتا تھا۔

بیگھا – زمین کی پیمائش کی ایک اکائی۔ انگریزوں سے پہلے زمین کا رقبہ یکساں نہیں ہوا کرتا تھا۔ بنگال میں انگریزوں نے اسے ایک معیار دیا جو تقریباً ایک ایکڑ کا تہائی ہوا کرتا تھا۔

مزدوروں کو بھی دوسری جگہ منتقل کرنا آسان نہیں تھا۔ بڑی زراعت کے لیے زیادہ مزدور درکار تھے اور جب ان کی ضرورت ہوتی تھی اس وقت وہ اپنی دھان کی فصل اگانے میں مصروف ہوتے تھے۔

بڑے پیمانہ پر نجی زراعت کے لیے زیادہ ہل اور بیل بھی درکار تھے۔ ایک بیگھا نیل کے لیے دو ہلوں کی ضرورت تھی۔ اس حساب سے ایک ہزار بیگھا زمین پر کاشت کرنے کے لیے دو ہزار ہل درکار تھے۔ زمین کی خرید میں سرمایہ کاری اور ہلوں کی نگہداشت ایک بڑا مسئلہ تھا۔ دوسرے کاشت کاروں سے بھی انھیں ہل بیل نہیں مل سکتے تھے۔ کیوں کہ عین نیل کی کاشت کے وقت کسان دھان کے کھیتوں میں مصروف ہوتے تھے۔

اسی لیے انیسویں صدی کے آخر تک شجرکار نج کاشت کے لیے زمینوں میں اضافہ کے تعلق سے تذبذب میں رہے۔ نیل کے لیے زیرکاشت زمین کا صرف 25 فیصد حصہ اس سسٹم کے تحت تھا۔ زمین کا بقیہ حصہ کاشت کے ایک دوسرے نظام کے تحت تھا۔ یعنی رعیتی نظام کے تحت۔

شکل 8– نیل کی کٹائی کرتے ہوئے مزدور، انیسویں صدی کے اوائل میں بنگال کے ایک کھیت میں مزدور نیل کی کٹائی کرتے ہوئے۔ (کولس وردی گرانٹ کی کتاب رورل لائف ان بنگال، 1860 سے)

ہندوستان میں نیل کے پودوں کی کٹائی مردوں کے ذریعہ ہوتی تھی۔

رعیت کی زمین پر نیل کی کاشت

رعیتی نظام کے تحت شجرکار رعیت کو ایک معاہدے پر دستخط کرنے کے لیے مجبور کرتا تھا۔ اکثر گاؤں کے مکھیا کو رعیت کی طرف سے (بغیر اس کی مرضی یا اجازت کے) اس معاہدے پر دستخط کرنے کے لیے مجبور کیا جاتا تھا۔ جو لوگ اس معاہدے پر دستخط کرتے تھے انھیں شجرکار کی طرف سے کم
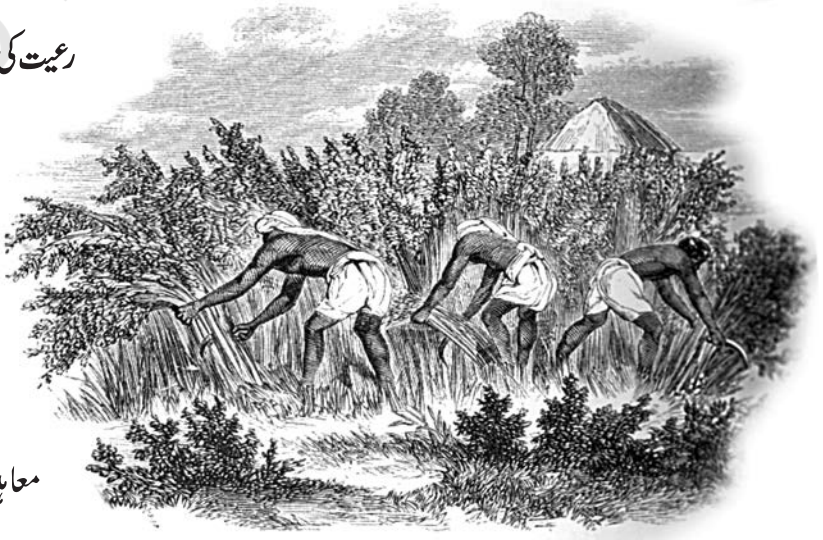
نیل کیسے تیار کیا جاتا تھا؟
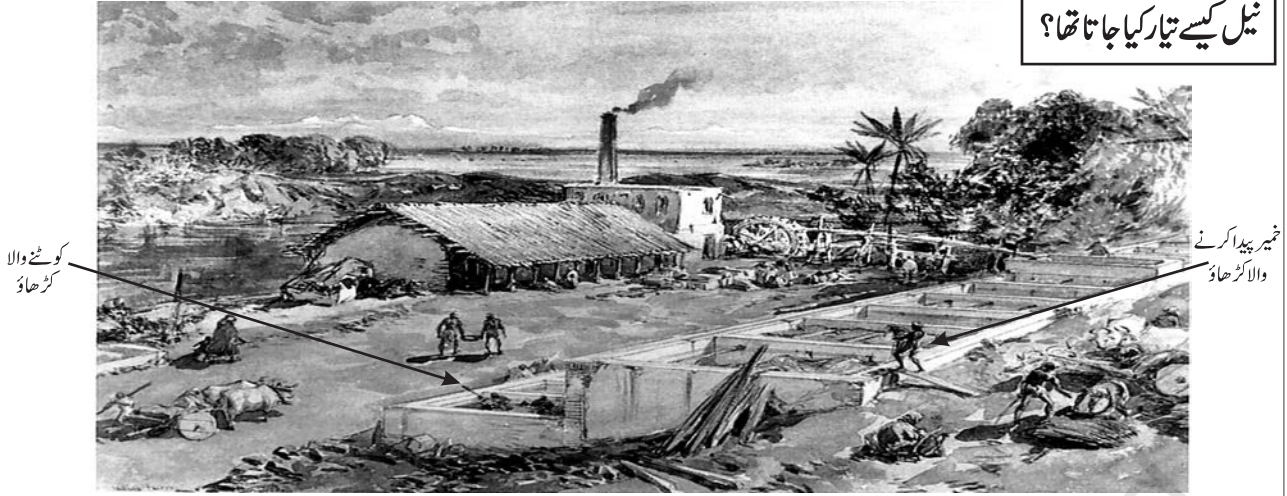
شکل 9– نیل کے کھیتوں کے نزدیک نیل کی ایک فیکٹری مصور ولیم سمپسن، 1863

نیل کے پیداواری گاؤں نیل کے ان کارخانوں کے اطراف آباد تھے جو شجرکاروں کی ملکیت تھے۔ فصل کٹنے کے بعد نیل کے پودے فیکٹریوں کے کڑھاؤ میں پہنچا دیے جاتے تھے۔ رنگ سازی کے لیے تین یا چار کڑھاؤں کی ضرورت پڑتی تھی۔ ہر کڑھاؤ کا کام الگ تھا۔ نیل کی پتیاں توڑ کر ایک کڑھاؤ میں (جسے خمیر پیدا کرنے والا یا گہرا کڑھاؤ کہا جاتا تھا) کئی گھنٹوں کے لیے گرم پانی میں بھگو دی جاتی تھیں۔ یہ عمل اس وقت تک جاری رہتا جب تک خمیر نہ اٹھ جاتا اور بلبلے نمودار نہ ہو جاتے تھے۔ اس کے بعد گلی ہوئی پتیوں کو نکال لیا جاتا تھا اور سیال کو دوسرے کڑھاؤ میں جو پہلے سے نیچے ہوتا تھا بہا دیا جاتا تھا۔

شکل 10– بالعموم عورتیں نیل کے پودوں کو کڑھائو تک پہنچاتی تھیں۔

دوسرے کڑھاؤ میں (جسے کوٹنے والا کڑھاؤ کہتے تھے) سیال کو متھا اور ایک چوڑے سرے والے چپو نما ڈنڈے سے کوٹا جاتا تھا۔ جب یہ سیال پہلے ہرا اور پھر نیلا ہو جاتا تھا تو کڑھاؤ میں چونے کا پانی ملا دیا جاتا تھا۔ نیل بتدریج الگ ہو کر پرتوں کی شکل میں حوض میں تہہ نشین ہو جاتا جو خاکی رنگ کے رسوب کی شکل میں ہوتا تھا اور صاف پانی کی سطح پر ابھر آتا تھا۔ مائع کو بہا دیا جاتا تھا۔ اب اس تہہ نشین نیل کی لگدی کو آخری حوض میں جسے جمانے والا کڑھاؤ کہا جاتا تھا، منتقل کر دیا جاتا تھا پھر اسے دبا کر اور خشک کر کے فروخت کیا جاتا تھا۔

شکل 11 – واٹ کو پیٹنے والے
نیل کے کارخانہ کا ایک مزدور کوٹنے والے چپو نما ڈنڈے کے ساتھ جس کا ایک سرا چوڑا ہوتا تھا اور جو نیل کا مائع کوٹنے کے کام آتا تھا۔ ان مزدوروں کو نیل کا مائع کوٹنے کے لیے آٹھ آٹھ گھنٹے مسلسل کمر برابر پانی میں رہنا پڑتا تھا۔

شکل 12 – نیل فروخت کے لیے تیار ہے۔

یہاں آپ پیداوار کا آخری مرحلہ دیکھ سکتے ہیں۔ نیل کے گودے کو دبانے اور شکل دینے کے بعد مزدور نیل پر مہریں لگا رہے ہیں اور ان کے ٹکڑے کر رہے ہیں۔ پس منظر میں آپ ایک مزدور کو ان ٹکڑوں کو خشک کرنے کے لیے لے جاتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں۔

کڑھاؤ (حوض)– تخمیر پیدا کرنے اور ذخیرہ رکھنے والے برتن کا نام۔

شکل 13– نیل کے پودے کھیتوں سے فیکٹری کی طرف لے جاتے ہوئے

شرح سود پر نیل کی پیداوار کے لیے روپیہ قرض دیا جاتا تھا۔لیکن یہ قرض رعیت کو پابند کر دیتا تھا کہ وہ اپنی کل زمین کے کم از کم 25 فی صد حصے پر نیل کی کاشت کرے گا۔شجر کار بیج اور ہل دے گا، جب کہ کسان زمین تیار کرے گا، بیج ڈالے گا اور فصل کی نگرانی کرے گا۔

جب کٹائی کے بعد فصل شجر کار کے حوالہ کر دی جاتی تو رعیت کو ایک نیا قرض دیا جاتا اور یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہتا۔کسان نے جو قرض کی دلکشی کی وجہ سے اس جال میں پھنس گئے تھے، جلد ہی محسوس کر لیا کہ یہ نظام کتنا نقصان دہ ہے۔جو قیمتیں فصل کی تیاری کے بعد انھیں ملتی تھیں بہت کم تھیں اور ان کے قرض کا چکر کبھی ختم نہیں ہوتا تھا۔

مسائل اور بھی تھے۔شجر کار بالعموم اصرار کرتے تھے کہ بہترین زمینوں پر نیل کی کاشت کی جائے جب کہ کاشت کار اسے اپنی دھان کی فصل کے لیے محفوظ رکھنا پسند کرتے تھے۔نیل کی جڑ گہری ہوتی تھی اور وہ زمین کی قوتِ نمو کو جلد ہی ختم کر دیتی تھی۔نیل کی فصل کے بعد اس زمین پر دھان کی فصل نہیں اگائی جا سکتی تھی۔

''نیل کی بغاوت'' اور اس کے بعد

مارچ 1859 میں ہزاروں رعیت نے بنگال میں نیل کی کاشت کرنے سے انکار کر دیا۔جیسے جیسے یہ بغاوت بڑھی رعیت شجر کاروں کو کرایہ ادا کرنے سے انکار کرتی رہی اور نیل کی فیکٹریوں پر لوگ تلواروں، بھالوں اور تیر کمانوں کے ساتھ حملہ آور ہو گئے۔عورتیں بھی

ماخذ 2

نیل کے پیداواری گاؤں کا ایک نغمہ

تحریکِ مزاحمت کے زمانے میں لوگ اکثر ایک دوسرے کو جوش دلانے اور اجتماعیت پیدا کرنے والے نغمے گایا کرتے تھے۔ان نغموں سے ان کے جذبات کا اندازہ ہوتا ہے۔نیل کی بغاوت کے دوران نشیبی بنگال کے دیہات میں سنا جانے والا ایک نغمہ درج ذیل ہے:

مولا ہاٹی کے شجر کاروں کی لمبی لاٹھیاں دور اکٹھی پڑی ہیں۔

کلکتہ کے بابو اس عظیم جنگ کا مشاہدہ کرنے کے لیے کشتیوں پر آ پہنچے ہیں۔

اس بار رعیت بھی تیار بیٹھی ہیں، اب وہ خاموشی سے پٹنے والے نہیں ہیں۔

اب وہ لٹھ بازوں سے بغیر لوہا لیے اپنی جانوں کا نذرانہ نہیں پیش کریں گے۔

باورچی خانوں کے برتن، دیگچیوں اور بیلنوں وغیرہ کے ساتھ باہر آ گئیں۔ شجرکاری کے کارکنوں کا سماجی بائیکاٹ کیا گیا اور محاصل وصول کرنے والے ان کے گماشتوں کو مارا گیا۔ رعیّتوں نے قسم کھائی کہ اب وہ نیل اگانے کے لیے پیشگی رقم (قرض) نہیں لیں گی اور نہ ہی وہ شجرکاروں کے قوی لٹھ بازوں کے دباؤ میں آئیں گی۔

نیل کی کاشت کاری کرنے والے کسانوں نے یہ فیصلہ کیوں کیا کہ وہ اب خاموش نہیں رہیں گے؟ واضح طور سے نیل کی پیداوار کا یہ طریقہ جابرانہ تھا لیکن مجبور ہمیشہ سرکشی نہیں کرتے، ایسا صرف کبھی کبھی ہی ہوتا ہے۔

1859 میں نیل پیدا کرنے والے رعیّتوں نے محسوس کیا کہ مقامی زمیندار اور دیہاتوں کے مکھیا شجرکاروں کے خلاف اس بغاوت میں ان کے ساتھ ہیں۔ بہت سے گاؤں میں جہاں مکھیاؤں کو زبردستی معاہدے پر دستخط کرنے پڑتے تھے، انھوں نے خود ان کسانوں کو متحرک کیا اور ان لٹھ بازوں کا جم کر مقابلہ کیا۔ دوسرے مقامات پر زمیندار دورہ کر کے کسانوں کو مزاحمت پر آمادہ کرتے رہے۔ یہ زمیندار شجرکاروں کی بڑھتی ہوئی قوت اور لمبے عرصہ کے لیے زمین کرایہ پر دینے کے جبری معاہدے پر ناراض تھے۔

نیل کے کاشت کار یہ بھی سمجھ رہے تھے کہ انگریزی حکومت شجرکاروں کے خلاف جدوجہد میں ان کی معاونت کرے گی۔ 1857 کی بغاوت کے بعد برطانوی حکومت کو ایک دوسری عام بغاوت ہو جانے کے امکانات سے تشویش تھی۔ جب نیل کے اضلاع میں ایک زبردست بغاوت کے ہونے کا خطرہ محسوس ہوا تو لفٹننٹ گورنر نے 1859 کے موسم سرما میں اس علاقہ کا دورہ کیا۔ رعیت نے اسے اپنی حالت زار پر حکومت کی ہمدردی کی علامت سمجھا۔ جب براسات کے مجسٹریٹ ایشلے ایڈن نے یہ حکم جاری کیا کہ رعیت نیل کا معاہدہ کرنے کی پابندی پر مجبور نہیں ہے تو یہ افواہ پھیل گئی کہ ملکہ وکٹوریہ نے اعلان کر دیا ہے کہ نیل اگانے ہی کی ضرورت نہیں ہے۔ ایڈن تو کسانوں کے جذبات کو ٹھنڈا کر کے دھماکہ خیز حالات پر قابو پانے کا کام انجام دے رہا تھا لیکن اسے باغیوں کے ساتھ تعاون سمجھا گیا۔

جیسے جیسے بغاوت پھیلتی گئی کلکتہ کے دانشور نیل کے ضلعوں میں پہنچنے لگے۔ انھوں نے رعیت کی پریشانیوں، شجرکاروں کے مظالم اور نیل کاری کی دہشت گردی کے بارے میں مضامین لکھے۔

بغاوت سے پریشان ہوکر شجر کاروں کی حفاظت کے لیے حکومت نے فوج کو متعین کیا اور نیل کی رائج کاشت کی تحقیقات کے لیے ایک نیل کمیشن کا تقرر کر دیا۔ کمیشن نے اپنی تحقیق میں شجر کاروں کو قصوروار ٹھہرایا اور انھیں نیل کے کاشت کاروں پر ظلم ڈھانے کا مجرم گردانا۔ اس نے یہ بھی فیصلہ دیا کہ نیل کی زراعت کاشت کاروں (رعیت) کے لیے قطعاً نفع بخش نہیں ہے۔ کمیشن نے رعیت سے کہا کہ معاہدہ کی مدت پوری کر لیں لیکن مستقبل میں وہ نیل پیدا کرنے سے انکار کر سکتے ہیں۔

سرگرمی

فرض کیجیے کہ آپ کو نیل کمیشن کے سامنے گواہی دینی ہے۔ کمیشن ڈبلیو ایس سیٹن کار آپ سے پوچھ رہے ہیں۔ ''رعیت کن شرائط پر نیل اگانے کو تیار ہوگی؟'' آپ کا جواب کیا ہوگا؟

ماخذ 3

''میں نیل کی کاشت کرنے کے بجائے بھیک مانگنا پسند کروں گا''

حاجی ملا (نیل کے ایک کاشت کار) ساکن چاند پور، تھانہ ہرڈی سے منگل، 5 جون 1860 کو نیل کمیشن کے ممبران نے بہت سے سوالات کیے۔ کچھ سوالوں کے جوابات درج ذیل ہیں:

ڈبلیو ایس سٹین کار، (نیل کمیشن کے صدر) کا سوال: کیا آپ اب نیل کی کاشت کرنے پر راضی ہیں، اگر نہیں تو کن نئی شرائط پر آپ اس کے لیے راضی ہوں گے؟

حاجی ملا: میں کاشت کے لیے بالکل آمادہ نہیں ہوں اور میں نہیں سمجھتا کہ کچھ نئی شرائط مجھے اس کے لیے راضی کر سکیں گی۔

مسٹر سیل (رکن): کیا آپ ایک روپیہ فی بنڈل معاوضہ پر بھی نیل اگانے کے لیے تیار نہیں ہیں؟

حاجی ملا: نہیں، بالکل نہیں! نیل اگانے کے بجائے میں پسند کروں گا کہ کسی دوسرے ملک کو ہجرت کر جاؤں اور اس کے بجائے بھیک مانگ کر زندگی گذاروں۔

(نیل کمیشن کی رپورٹ: جلد 2، 'گواہوں کی روداد یں' صفحہ 67)

اس بغاوت کے بعد بنگال میں نیل کی پیداوار دم توڑ گئی، لیکن اب شجر کاروں نے بہار کو اپنی آماجگاہ بنایا۔ انیسویں صدی کے آخر میں کیمیاوی رنگوں کی دریافت کے بعد ان کی تجارت بہت متاثر ہوئی۔ اس کے باوجود وہ پیداوار کو بڑھانے میں کامیاب رہے۔ جب مہاتما گاندھی جنوبی افریقہ سے واپس آئے تو بہار کے ایک کاشت کار نے انھیں چمپارن کا دورہ کرنے اور وہاں کاشت کاروں کی حالت زار کا مشاہدہ کرنے پر آمادہ کیا۔ نیل کے شجر کاروں کے خلاف 1917 میں مہاتما گاندھی کے دورے نے چمپارن کے نیل شجر کاروں کے خلاف تحریک میں ایک سنگ میل کا کام کیا۔

دوسرے مقامات پر

ویسٹ انڈیز میں نیل کی پیداوار

اٹھارھویں صدی کی ابتدا میں، جین باپٹسٹ لاباٹ (Jean Baptiste Labat) نامی ایک عیسائی مشنری نے کیریبین جزائر کا سفر کیا اور وہاں کے حالات کا گہرائی سے جائزہ لیا۔ اس کی مطبوعہ کتابوں میں سے منتخب کردہ یہ تصویر فرانسیسی غلاموں کے ذریعہ نیل کے تمام مراحل کی منظرکشی کرتی ہے۔ آپ غلام کاریگروں کو نیل کے پودوں کو بائیں طرف جمنے والے کڑھاؤ میں ڈالتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں۔ دوسرا کاریگر ایک متھنے والی مشین سے اس سیال کو متھ رہا ہے۔ (دائیں طرف سے دوسرا کڑھاؤ) دو کاریگر تھیلوں میں لٹکائے ہوئے نیل کی لگدی کو سکھانے کے لیے لے جا رہے ہیں۔ سامنے زمین پر دوسرے مزدور نیل کی لگدی کو سانچوں میں بھرنے کے لیے ملا رہے ہیں۔ شجرکار درمیان میں ایک بلند چبوترے پر کھڑا غلام کاریگروں کے کام کی نگرانی کر رہا ہے۔

شکل 14 – کیریبین (جزائر) میں کھیتوں میں غلاموں کے ذریعہ نیل بنانے کی تیاری

دوہرائیے

1. جوڑیاں لگائیے:

رعیت	گاؤں
محال	کسان
نِج	رعیت کی زمینوں پر کاشت
رعیتی	شجرکاروں کی اپنی زمینوں پر کاشت

2019-20

2. خالی جگہوں کو پر کیجیے۔

(a) یورپ میں ووڈ کی کاشت کرنے والوں نے........................ کو ایسی فصل کی شکل میں دیکھا جو ان کی آمدنی سے مسابقت کرے گی۔

(b) برطانیہ میں اٹھارھویں صدی کے اواخر میں نیل کی مانگ........................ کی وجہ سے بڑھ گئی۔

(c) چمپارن تحریک...................... کے خلاف تھی۔

آئیے تصور کریں

آپ اس گفتگو کا تصور کیجیے جو ایک شجر کار اور اس کسان کے درمیان ہوئی جسے نیل کی کاشت پر مجبور کیا گیا ہے۔ شجر کار کسان کو راضی کرنے کے لیے کون سے دلائل دے گا؟ کسان کن دشواریوں کو سامنے لائے گا؟ ان کے مکالمہ کو قلم بند کیجیے۔

گفتگو کیجیے

3. بندوبست دوامی کی اہم خصوصیات بیان کیجیے۔

4. محال واری طریقہ بندوبست دوامی سے کن معنوں میں مختلف تھا؟

5. منرو کے نئے طریقے سے، جس میں لگان متعین کر دیا گیا تھا جو مسائل پیدا ہوئے ان میں سے دو کو بیان کیجیے۔

6. رعیت نیل کی کاشت پر کیوں آمادہ نہیں تھے؟

7. وہ کون سے حالات تھے جن کی وجہ سے بالآخر بنگال میں نیل کی پیداوار نے دم توڑ دیا؟

کر کے دیکھیے

8. چمپارن تحریک اور اس میں مہاتما گاندھی کے کردار کے بارے میں مزید معلومات حاصل کیجیے۔

9. ہندوستان میں چائے یا کافی کی پیداوار کی تاریخ پر غور کیجیے۔ بتائیے کہ ان کی پیداوار اور نیل کی کاشت میں مصروف مزدوروں یا کاشت کاروں کی زندگیاں کیسی تھیں۔

4824CH04

4 آدی واسی، دیکو اور سنہرے دور کا تصور

1895 میں جھارکھنڈ کے ضلع چھوٹا ناگپور میں ایک شخص جس کا نام بیرسا تھا جنگلوں اور دیہاتوں میں گھومتا ہوا پایا گیا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ طلسماتی قوتوں کا حامل ہے۔ وہ تمام بیماریوں کا علاج کر سکتا ہے اور اناج کو کئی گنا بڑھا سکتا ہے۔ بیرسا نے اعلان کیا کہ مجھے خدا نے لوگوں کو تکلیفوں سے نجات دلانے اور دیکو (Dikus) یعنی بیرونی لوگوں کی غلامی سے آزاد کرانے پر متعین کیا ہے۔ جلد ہی لوگ بیرسا کے پیروکار بن گئے۔ وہ اسے بھگوان سمجھتے جو ان کے تمام مسائل حل کرنے کے لیے آیا تھا۔

بیرسا منڈاؤں کے ایک خاندان میں، جو چھوٹا ناگپور ضلع کا ایک قبیلہ ہے، پیدا ہوا تھا۔ لیکن اس کے پیروکار دوسرے علاقوں کے قبیلوں — سنتھال اور اوراؤں سے بھی تعلق رکھتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک انگریزی حکومت کے دوران ہونے والی تبدیلیوں اور پیش آنے والے مسائل سے ناخوش تھا۔ ان کا معروف طریقۂ زندگی تبدیل ہوتا جا رہا تھا، ان کی روزی خطرے میں تھی اور ان کے مذہب کو بھی خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔

شکل 1 – اڑیسہ میں ڈونگریا کندھ قبیلے کی عورتیں بازار جانے کے لیے دریا پار کرتی ہوئیں

وہ کیا مسائل تھے جن کو حل کرنے کا بیرسا نے دعویٰ کیا؟ بیرونی لوگ کون تھے جن کو دیکو کا نام دیا گیا؟ اور کیسے انھوں نے علاقے کے لوگوں کو غلام بنایا؟ انگریزوں کی حکومت میں آدی واسیوں کے لیے کیا مسائل پیدا ہو رہے تھے؟ ان کی زندگیوں کا معمول کیسے تبدیل ہو رہا تھا؟ یہ اُن سوالات میں سے چند ہیں جن کے بارے میں آپ اس باب میں پڑھیں گے۔

آپ آدی واسی سماج کے بارے میں پچھلے سال پڑھ چکے ہیں۔ آدی واسیوں کے بہت سے قبیلوں کے رسم و رواج برہمنوں کے مرتب کیے

ہوئے رسم و رواج سے مختلف تھے۔ یہ سماج ذات پات کی تفریق میں بھی مبتلا نہ تھا، جیسا کہ ذات پات پر مبنی سماج کی خصوصیت تھی۔ ایک قبیلہ کے سبھی افراد اپنے کو یکساں برادری کا فرد محسوس کرتے تھے۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ ان کے قبیلے کے اندر سماجی اور معاشی نا برابری کا وجود نہیں تھا۔

آدی واسیوں کے گروہ کیسے رہتے تھے؟

انیسویں صدی کے آتے آتے ہندوستان کے مختلف حصوں میں رہنے والے آدی واسی طرح طرح کے کاموں میں حصہ لینے لگے تھے۔

فالو – فالو وہ کھیت جسے کچھ عرصہ تک بغیر بوئے ہوئے چھوڑ دیا گیا ہو تا کہ اس کی زرخیزی واپس آ جائے۔

سال – ایک درخت ہے۔

مہوہ – ایک پھول جسے کھایا جاتا ہے اور جس سے شراب بھی بنائی جاتی ہے۔

کچھ جھوم کاشت کاری کرتے تھے

ان میں سے کچھ جھوم کاشت کاری کرتے تھے یعنی کاشت کی جگہ تبدیل کرتے رہتے تھے (اسے گشتی کاشت کاری کہتے ہیں)۔ یہ کام ایک چھوٹے قطعہ زمین پر کیا جاتا تھا جو زیادہ تر جنگلوں میں ہوتا تھا۔ کسان درختوں کے بالائی حصوں کو کاٹ دیتے تھے تا کہ سورج کی روشنی زمین تک پہنچ سکے وہ زمین پر اُگی ہوئی گھاس پھوس کو جلا دیتے تا کہ وہ کھیتی کے لیے صاف ہو جائے۔ وہ راکھ کو زمین پر پھیلا دیتے تھے تا کہ اس میں موجود پوٹاش کھاد کا کام کر سکے۔ وہ درخت کاٹنے کے لیے کلہاڑی اور زمین کھرچنے کے لیے کھرپی استعمال کرتے تھے تا کہ وہ کاشت کے قابل ہو سکے۔ وہ بجائے ہل چلا کر بیج بونے کے، بیجوں کو ویسے ہی بکھیر دیتے تھے۔ ایک بار فصل تیار ہونے اور کٹ جانے کے بعد وہ دوسرے کھیت بناتے تھے۔ کھیت سے ایک بار فصل اگانے کے بعد وہ اسے کئی برس تک **فالو** (Fallow) کی حیثیت سے چھوڑ دیتے تھے۔

ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے والے گشتی کاشت کار شمال مشرق اور وسطی ہندوستان کے پہاڑی اور جنگلاتی حصوں میں پائے جاتے تھے۔ ان آدی واسی باشندوں کی

شکل 2 – اڑیسہ میں ڈونگریا کندھ عورتیں پلیٹ بنانے کے لیے جنگل سے پنڈانوس کی پتیاں لے جاتی ہوئیں

زندگی کا انحصار جنگل میں آزادانہ نقل وحرکت اور زمین اور جنگل کو قابل کاشت بنانے پر تھا۔ یہی ایک طریقہ تھا جسے وہ کھیتی کی منتقلی کے لیے استعمال کرسکتے تھے۔

شکاری اور اشیا چننے والے

بہت سے علاقوں میں آدی واسیوں کے گروپ شکار کرتے تھے یا جنگل کی اشیا چن کر کام چلاتے تھے۔ ان کے لیے جنگل زندگی بسر کرنے کا ایک خاص ذریعہ تھا۔ اڑیسہ میں ایسی ہی ایک برادری ''کھونڈوں'' کی تھی۔ یہ اجتماعی شکار کرتے تھے اور گوشت تقسیم کرلیا کرتے تھے۔ یہ جنگل سے پھل اور جڑیں جمع کرتے اور **سال** اور **مہوہ** کے بیج کے تیل سے کھانا پکاتے تھے۔ یہ بہت سی جنگلی جڑی بوٹیاں بطور دوا استعمال کرتے تھے اور جنگل کی دیگر بہت سی اشیا مقامی بازار میں فروخت کرتے تھے۔ مقامی بنکر اور چرم فروش جب کپڑا اور چمڑا رنگنے کے لیے رنگ کی ضرورت محسوس کرتے تو کُسم اور پلاش کے پھولوں کے لیے کھونڈ برادری کی طرف رجوع کرتے تھے۔

ان جنگلی باشندوں کو چاول اور دوسرے اناج کہاں سے ملتے تھے؟ ایک عرصے تک یہ جنگل کی اشیا اپنی ضروریات کے لیے تبادلے کے طور پر استعمال کرتے رہے۔ پھر کچھ عرصہ وہ اپنی محدود پس انداز رقم سے یہ اشیا خریدتے رہے۔ ان میں سے کچھ لوگ گاؤں میں متفرق کام کرتے رہے جیسے بوجھ ڈھونا، سڑک تعمیر کرنا یا کاشت کاروں اور کسانوں کے کھیتوں میں مزدوری کرنا۔ جب جنگل میں قابل فروخت اشیا کم ہو گئیں تو یہ لوگ بڑی تعداد میں کام کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے۔ لیکن وسطی ہندوستان کے ''بائیگا'' قبائل کی طرح ان میں بہت سے لوگ دوسروں کی مزدوری کرنے سے احتراز کرتے رہے۔ بائیگا اپنے کو جنگل کا باسی کہتے تھے جو صرف جنگل کی اشیا پر ہی گزر بسر کرسکتے تھے۔ مزدوری کرنا ان بائیگا لوگوں کی توہین تھی۔

شکل 3 – ہندوستان کے کچھ قبائلی گروپ کی جغرافیائی نشان دہی

2019-20

ماخذ 1

شکار کا وقت، بیج بونے کا وقت، نئے کھیتوں میں منتقل ہونے کا وقت

کیا آپ نے کبھی غور کیا کہ مختلف سماجوں میں رہنے والے لوگ کام اور وقت کا یکساں احساس نہیں رکھتے؟ مختلف علاقوں میں کھیتیاں تبدیل کرنے اور شکار کرنے والوں کی زندگیاں کیلنڈر (جنتری) اور مردوں اور عورتوں کے درمیان کام کی تقسیم کے لحاظ سے منضبط ہوتی تھیں۔

برطانوی ماہر بشریات ویریئر ایلون 1930 اور 1940 کے درمیانی عرصے میں وسطی ہندوستان کے بائیگا اور کھونڈ قبائل کے درمیان کئی برسوں تک رہا۔ وہ ہمیں اس کیلنڈر اور تقسیم کار کی معلومات دیتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

چیت کے مہینے میں عورتیں صفائی کرنے اور ڈنٹھلوں کو جن کی فصل کاٹی جا چکی ہوتی، کاٹنے جاتی تھیں۔ مرد بڑے درختوں کو کاٹنے اور رسم کے مطابق شکار کرنے جاتے تھے۔ شکار بدر کامل (پورن ماشی) میں مشرق سے شروع ہوتا تھا۔ شکار میں بانس کے پنجرے استعمال کیے جاتے تھے۔ عورتیں پھل یا بیج جیسے ساگودانہ، املی اور کُکرمتا جمع کرتیں، بائیگا عورتیں صرف قند اور مہوا کے بیج ہی جمع کر پاتی تھیں۔ وسطی ہندوستان کے تمام آدی واسی قبائل میں بائیگا بہترین شکاری مانے جاتے تھے۔ بیساکھ میں جنگل میں آگ لگائی جاتی تھی اور عورتیں بغیر جلی ہوئی لکڑیاں اکٹھا کرتی تھیں۔ مرد شکار کرنا جاری رکھتے تھے لیکن اپنے گاؤں کے نزدیک۔ جیٹھ کے مہینے میں بیج بوئے جاتے تھے لیکن شکار جاری رہتا تھا۔ اساڑھ سے بھادوں تک لوگ کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ پھلیوں کی پہلی فصل کوار میں تیار ہوتی تھی اور کارتک کٹکی میں پک جاتی تھی۔ اگھن تک ہر فصل تیار ہو جاتی تھی اور پوس میں اُسانے (ڈنٹھلوں سے دانے الگ کرنے) کا کام ہوتا تھا۔ پوس کا زمانہ ناچ گانے اور شادیوں کا بھی ہوتا تھا۔ ماگھ میں نئے بیوار کی طرف ہجرت ہوتی تھی اور گزارے کے بنیادی کام شکار کرنا اور غذا اکٹھا کرنا، انجام دیے جاتے تھے۔

مذکورہ بالا بیان کردہ دور پہلے سال کا ہے۔ دوسرے سال میں شکار کے لیے زیادہ وقت ملتا تھا اور کچھ ہی فصلیں بوئی اور کاٹی جاتی تھیں۔ لیکن چونکہ غذائی ذخیرہ کافی ہوتا تھا اس لیے مرد بیواروں میں رہ لیتے تھے۔ تیسرے سال میں البتہ یہ ہوتا تھا کہ غذا کی کمی جنگلاتی پیداوار سے پوری کی جاتی تھی۔

ویریئر ایلون کی کتاب بائیگا (1939) اور ایلون کے غیر شائع شدہ 'کھونڈپر نوٹس' (ویریئر ایلون پیپرس، نہرو میموریل میوزیم اینڈ لائبریری) سے اخذ کیا گیا

شکل 4- ایک سنتھالی لڑکی جلانے کی لکڑی لے جاتی ہوئی، بہار، 1946
بچے اپنی ماؤں کے ساتھ جنگل کی پیداوار جمع کرنے جاتے تھے۔

سرگرمی

ان تمام کاموں پر بغور نظر ڈالیے جو بائیگا قبیلہ کے مرد اور عورتیں انجام دیتی تھیں۔ ان سے جتنے قسم کے کام متوقع تھے ان میں کیا فرق تھے؟

2019-20

آدی واسی گروپ کو اپنے علاقے میں نہ ملنے والی اشیا کی خرید و فروخت کرنی پڑتی تھی۔ تاجر اپنی اشیا کے ساتھ آتے اور انھیں اونچی قیمت پر فروخت کرتے تھے۔ مہاجن انھیں قرض دیتے تھے جسے وہ اپنی کمائی کی رقم میں ملا کر نقد رقم کی ضرورت کو پورا کر سکیں۔ لیکن اس قرض کا سود بالعموم بہت زیادہ ہوتا تھا۔ قبائلیوں کے لیے بازار اور تجارت کے معنی قرض اور غربت ہوا کرتے تھے۔ اس وجہ سے ان کے نزدیک مہاجن اور تاجر بیرونی لوگ تھے جو اُن کی پریشانیوں کے ذمہ دار تھے۔

کچھ لوگ مویشی پالتے تھے

کچھ قبائلی گروپ مویشی پالنے اور ان کی افزائش نسل کا کام کرتے تھے۔ موسموں کے مطابق یہ چراگاہوں کی تلاش میں اپنے ریوڑوں کے ساتھ جگہ تبدیل کرتے رہتے تھے۔ جب ایک جگہ کی گھاس ختم ہو جاتی تو وہ دوسری چراگاہ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے تھے۔ پنجاب کے پہاڑوں کے ''ون گوجر'' اور آندھرا پردیش کے ''لباڈی'' مویشی پالتے تھے۔ کلو کے ''گدی'' بھیڑیں پالتے تھے اور کشمیر کے ''بکروال'' بکریوں کی افزائش نسل کرتے تھے۔ آپ آئندہ سال ان لوگوں کے بارے میں مزید معلومات حاصل کریں گے۔

بیوار – مدھیہ پردیش میں کاشت کاری کے لیے انتقال آراضی کے لیے مستعمل ایک اصطلاح

کچھ لوگوں نے ایک ہی جگہ زراعت اختیار کر لی

انیسویں صدی کے قبل ہی سے ان قبائلیوں کے بہت سے گروپوں نے مستقل سکونت اختیار کرنی شروع کر دی تھی اور یہ ہر سال بجائے نقل مکانی کے ایک ہی جگہ پر اپنی کھیتی کرنے لگے۔ انھوں نے ہل استعمال کرنا شروع کر دیا اور بتدریج انھیں زمین پر ملکیت کا حق حاصل ہو گیا۔ بہت سے معاملات میں جیسے کہ چھوٹا ناگپور کے منڈا قبائل ہیں، زمین اجتماعی طور سے پورے خاندان کی سمجھی جاتی تھی۔ خاندان کا ہر فرد یہاں پر اصلاً آباد ہونے اور زمین کو صاف کرنے والے کا وارث سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے ان میں ہر ایک کا زمین پر یکساں حق تھا۔ پھر خاندان میں کچھ لوگوں نے زیادہ قوت حاصل کر لی اور سربراہ بن گئے، بقیہ لوگ ان کے تابع ہو گئے۔ طاقتور لوگوں نے بجائے خود کاشت کرنے کے اکثر اپنی زمینوں کو کرایہ پر دینا شروع کر دیا۔

2019-20

برطانوی اہل کاروں کے نزدیک گونڈ اور سنتھال جیسے سکونت پذیر قبیلے دوسرے شکاری اور مہاجر کاشت کاروں کے مقابلہ میں زیادہ مہذب تھے۔ جو لوگ جنگلوں کے باسی تھے وہ جنگلی اور وحشی کہلائے، انھیں مہذب بنانے اور مستقل مکانات فراہم کرنے کی ضرورت تھی۔

نوآبادیاتی نظام نے قبائلی زندگی پر کیا اثر ڈالا؟

انگریزی دورِ حکومت میں آدی واسیوں کی زندگی میں تبدیلی آئی۔ آیئے دیکھیں کہ یہ تبدیلیاں کیا تھیں۔

قبائلی سرداروں پر کیا گزری؟

انگریزوں کی آمد سے قبل بہت سے علاقوں میں قبائلی سرداروں کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ وہ کچھ معاشی برتری رکھتے تھے اور اپنے علاقوں کے انتظام میں بھی ان کا دخل تھا۔ بعض جگہوں پر ان کی اپنی پولیس ہوتی تھی اور وہ زمینوں اور جنگلات کے معاملات میں فیصلہ کن اختیار رکھتے تھے۔ انگریزوں کی آمد کے بعد قبائلی سرداروں کے اختیارات میں کافی تبدیلی آئی۔ انھیں گاؤں کے گروپ پر ملکیت اور زمینوں کو کرایہ پر دینے کا حق دیا گیا، لیکن زمین پر ان کے تنظیمی اختیار کو سلب کرکے ہندوستان میں برطانوی حکومت کے بنائے ہوئے قوانین کا تابع ہونے پر مجبور کر دیا گیا۔ انھیں اب برطانوی حکومت کو نذرانہ ادا کرنا پڑتا تھا اور برطانوی حکومت کی طرف سے قبائلی گروپ کو قاعدے اور قانون کی پابندی بھی کرانی پڑتی تھی۔ انھیں اپنے آدمیوں پر پہلے جو اختیار حاصل تھا وہ انھوں نے کھو دیا اور روایتی کاموں کو انجام دینے کے قابل نہیں رہے۔

گشتی کاشت کاروں پر کیا گزری؟

انگریز ایسے گروہوں سے غیر مطمئن تھے جو خانہ بدوش تھے اور جن کا مستقل گھر نہیں تھا۔ وہ قبائل کے ایک جگہ بس جانے اور مستقل زراعتی زندگی اپنانے کے خواہش مند تھے۔ ایک جگہ مستقل بود و باش رکھنے والے کسانوں کو مہاجر لوگوں کے مقابلہ میں کسی انتظام کے تحت رکھنا آسان تھا۔ اس کے علاوہ انگریز اپنی مملکت کے لیے مالیہ کے کسی مستقل ذریعے کے

شکل 5– شمال مشرق میں نشی قبائل کے ایک گاؤں میں لٹھوں سے بننے والا ایک زیرتعمیر مکان۔
جب لٹھوں سے مکانات بنائے جاتے تھے تو پورا گاؤں اس میں مدد کرتا تھا۔

شکل 6– گجرات کے ایک جنگل میں کاشت کرتی ہوئیں بھیل عورتیں
گشتی کاشتکاری کا عمل گجرات کے بہت سے جنگلاتی رقبہ میں جاری تھا۔ آپ اس تصویر میں کھیتی کے لیے درختوں کو کٹا اور زمین کو صاف دیکھ سکتے ہیں۔

خواہش مند تھے۔ اس لیے انھوں نے زمینوں کے بندوبست کا نظام رائج کیا۔ یعنی انھوں نے زمین کی پیمائش کی۔ زمین کے تعلق سے ہر فرد کی ذمہ داری بتائی اور حکومت کو ادا کرنے کے لیے سالانہ مالیہ مقرر کر دیا۔ کچھ لوگوں کو زمیندار اور دوسروں کو مزارع قرار دیا گیا۔ جیسا کہ آپ باب 2 میں پڑھ چکے ہیں، مزارع زمیندار کو کرایہ ادا کرتا اور وہ بدلے میں حکومت کو لگان ادا کرتے تھے۔

جھوم کسانوں کو مستقل طور سے آباد کرنے کی انگریزوں کی کوشش زیادہ کامیاب نہیں ہوئی۔ ہل چلا کر مستقل طور سے کھیتی کرنا، ان علاقوں میں جہاں پانی کم اور زمین خشک تھی آسان نہیں تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جھوم کسان جنھوں نے ہل چلا کر کھیت جوتنا شروع کر دیا تھا۔ اکثر نقصان میں رہتے تھے کیوں کہ ان کی محنت اچھا پھل نہیں لاتی تھی۔ اس لیے شمال مشرقی علاقہ کے جھوم کسانوں نے اپنے روایتی طریق زراعت ہی پر اصرار کیا۔ ایک وسیع احتجاج کا سامنا کرتے ہوئے انگریزوں کو بالآخر انھیں جنگل کے کچھ حصوں میں زراعتی مقام کی تبدیلی کی اجازت دینی پڑی۔

شکل 7 – آندھرا پردیش کے ایک دھان کے کھیت میں کام کرتے ہوئے آدی واسی مزدور۔
میدانی علاقوں اور جنگلاتی علاقوں میں چاول کی کاشت کا فرق نوٹ کیجیے۔

2019-20

جنگلات کے قوانین اوران کے اثرات

جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں قبائلیوں کی زندگی جنگلوں ہی سے وابستہ تھی اس لیے جنگلات کے قوانین میں تبدیلی نے قبائلی گروہوں کو خاصہ متاثر کیا۔ انگریزوں نے اپنی حکومت جنگلات تک وسیع کر دی اور جنگلات کو سرکاری زمین قرار دے دیا کچھ جنگلات کو خصوصی درجہ دیا گیا۔ کیوں کہ وہاں عمارتی لکڑی کے درخت تھے جن کی انگریزوں کو ضرورت تھی۔ ان علاقوں میں عام آدمیوں کو آزادانہ آنے جانے کی اجازت نہیں تھی نہ ہی انھیں جھوم طرز کی کھیتی کرنے، پھل اکٹھا کرنے یا جانوروں کا شکار کرنے کی آزادی تھی۔ ان نامساعد حالات میں جھوم کاشت کار کیسے زندہ رہ سکتے تھے؟ ان میں سے بہت سے دوسرے علاقوں میں مزدوری اور روزی حاصل کرنے کے لیے ہجرت کر گئے۔

سلیپر۔ لکڑی کے سیدھے کٹے ہوئے موٹے تختے جن پر ریل کی پٹریاں بچھائی جاتی ہیں۔

ماخذ 2

''انگریزوں کی اس سرزمین پر جینا کس قدر مشکل ہے''

1930 میں ویریئر ایلون نے وسطی ہندوستان کے ایک آدی واسی گروپ بائیگا کے علاقے میں گیا۔ وہ ان کے رسم ورواج، طور طریقے، کام، فنون لطیفہ اور روایتیں وغیرہ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتا تھا۔ اس نے بہت سے گیت ریکارڈ کیے جن میں برطانوی دور حکومت میں بائیگاؤں کی مشکلات کا نوحہ تھا۔ ایک نوحہ یہ ہے۔

انگریزوں کی اس سرزمین میں زندگی کتنی دشوار ہے
کتنا مشکل ہے جینا
گاؤں میں زمیندار کا ڈیرا ہے
دروازہ پر کوتوار (کوتوال) بیٹھا ہے
باغ میں پٹواری کی نشست ہے
اور کھیت پر حکومت کی حکمرانی ہے
انگریزوں کی اس سرزمین میں زندگی کس قدر دشوار ہے
جانوروں کا ٹیکس ادا کرنے کے لیے ہم اپنی گائے فروخت کر دیتے ہیں
جنگل کا ٹیکس ادا کرنے کے لیے ہمیں اپنی بھینس فروخت کرنی پڑتی ہے
زمین کا ٹیکس ادا کرنے کے لیے ہم اپنے بیل بیچ دیتے ہیں
اب ہمیں غذا کون دے گا؟
انگریزوں کی اس سرزمین میں

ویرئیر ایلون اور شام رائو ہیوالے کی تصنیف 'مائیکال کے گیت' صفحہ 316 سے ماخوذ

لیکن ایک مرتبہ جب انگریزوں نے قبائلی گروہوں کو جنگلوں میں رہنے سے روک دیا تو خود ان کے لیے مسائل پیدا ہو گئے۔ محکمۂ جنگلات اب لکڑی کاٹنے، سلیپر بنانے اور انھیں دوسری جگہ بھیجنے کے لیے مزدور کہاں سے پاتا؟

نو آبادیاتی اہل کاروں نے ایک حل پیش کیا۔ انھوں نے جھوم کسانوں کو جنگلوں میں ایک مختصر قطعۂ آراضی اور اس پر کاشت کرنے کی اجازت دینے کا اس شرط پر فیصلہ کیا کہ گاؤں کے رہنے والے محکمۂ زراعت کو مزدور فراہم کریں گے اور جنگلات کی نگرانی بھی کریں گے۔ اس طرح محکمۂ جنگلات نے سستے مزدوروں کی دریافت کے لیے جنگلاتی گاؤں کو وجود بخشا۔

شکل 8- گودارا عورتیں بُنائی کرتی ہوئیں

بہت سے آدی واسی قبیلوں نے نو آبادیاتی جنگلات کے قانون کے خلاف اپنا ردعمل ظاہر کیا۔ انھوں نے نئے قوانین کی خلاف ورزی کی۔ غیر قانونی قرار دیے گئے طریقوں پر کاربند رہے اور کبھی کبھی کھلی بغاوت پر بھی اتر آئے۔ 1906 میں آسام کی سون گرام سنگما کی شورش اور 1930 کی دہائی میں مرکزی صوبہ جات میں جنگل ستیہ گرہ اسی کی مثال تھیں۔

تجارت کا مسئلہ

انیسویں صدی عیسوی میں آدی واسی قبیلوں نے دیکھا کہ تاجر اور مہاجن اب جنگلوں کا چکر زیادہ لگانے لگے ہیں تاکہ جنگلاتی اشیا کی خریداری کر سکیں، نقد رقم قرض پر دے سکیں اور انھیں مزدوری کرنے پر آمادہ کر سکیں۔ آدی واسی قبائل کو ان حالات کے نتائج کو سمجھنے میں کچھ وقت لگا۔

شکل 9 - ایک ہاجانگ عورت چٹائی بُنتی ہوئی

عورتیں گھریلو استعمال کی چیزیں گھروں ہی میں نہیں تیار کرتی تھیں بلکہ کھیتوں اور کارخانوں میں بھی تیار کرتی تھی جہاں وہ اپنے بچوں کو بھی ساتھ لے جاتی تھیں۔

آیئے ہم ریشم کی پیداوار کو دیکھیں۔ اٹھارہویں صدی میں یورپ کے بازاروں میں ہندوستانی ریشم کی زبردست مانگ تھی۔ اس اعلیٰ قسم کے ہندوستانی ریشم کی وہاں بہت زیادہ قیمت تھی اور جلد ہی اس کی ہندوستان سے برآمد میں زبردست اضافہ ہوگیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اہل کاروں نے اس بڑھتی ہوئی مانگ کے مدنظر ریشم کی پیداوار کو بڑھانے کی حوصلہ افزائی کی۔

موجودہ جھارکھنڈ کا ایک ضلع ہزاری باغ وہ علاقہ تھا جہاں سنتھالی ریشم کے کیڑے پالتے تھے۔ ریشم کے تاجر اپنے ایجنٹوں کو ان علاقوں میں بھیجتے تھے جو ان قبائلیوں کو قرض دیتے تھے اور ریشم کے کوئے حاصل کرتے تھے۔ کیڑے پالنے والوں کو ایک ہزار کویوں کے لیے تین سے چار روپے دیے جاتے تھے۔ یہاں سے یہ بردوان یا گیا بھیج دیے جاتے تھے جہاں وہ پانچ گنی قیمت پر فروخت ہوتے تھے۔ یہ درمیانی لوگ ریشم پیدا کرنے والوں اور اسے برآمد کرنے والوں سے زبردست نفع کماتے تھے۔ ریشم پیدا کرنے والوں کو بہت ہی کم مختنانہ ملتا تھا۔ ممکن ہے کہ ان آدی واسیوں نے بازار دیکھ لیا ہوگا اور درمیانی تاجروں کو وہ اپنا دشمن سمجھنے لگے ہوں گے۔

شکل 10– بہار میں کوئلے کی کان میں کام کرنے والے مزدور، 1948
1920 میں جھریا اور رانی گنج کے کوئلے کی کانوں میں کام کرنے والے 50 فیصد مزدور آدی واسی تھے۔ تاریک اور دم گھٹا دینے والی گہری کانیں صرف کمر توڑ ہی نہیں بلکہ اکثر جان لیوا بھی ثابت ہوتی تھیں۔ 1920 کی دہائی میں ہندوستان کی کوئلے کی کانوں میں مرنے والوں کی تعداد سالانہ دو ہزار سے زیادہ تھی۔

کام کی تلاش

کام کی تلاش میں اپنے گھروں سے دور جانے والے قبائلیوں کی حالت اور خراب تھی۔ انیسویں صدی کے آخر تک چائے کی کاشت میں اضافہ ہوتا گیا اور کان کنی بھی صنعت میں تبدیل ہو گئی۔ آدی واسیوں کو آسام کے چائے کے باغات اور جھارکھنڈ کے کوئلے کی کانوں میں کام پر لگایا گیا۔ انھیں ٹھیکہ داروں کے ذریعہ بھرتی کیا جاتا تھا جو نہایت ہی حقیر تنخواہ دیتے تھے اور انھیں گھروں کو لوٹ جانے سے بھی روکتے تھے۔

سرگرمی

پتہ لگائیے کہ کیا اب کانوں میں کام کرنے والوں کی حالت میں کوئی تبدیلی آئی ہے۔ معلوم کیجیے کہ ہر سال کانوں میں کتنے مزدوروں کی موت ہوتی ہے، اور اس کے کیا اسباب ہیں۔

قریبی مشاہدہ

انیسویں اور بیسویں صدی کے درمیان ملک کے مختلف قبائلی گروہوں نے قوانین میں تبدیلی، رسم ورواج پر پابندی، نئے ٹیکسوں کے نفاذ اور تاجروں اور مہاجنوں کے استحصال کے خلاف بغاوت کی۔ کول آدی واسیوں نے 31-1830 میں اس کی ابتدا کی۔ 1855 میں سنتھال بغاوت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ وسطی ہندوستان میں بستر کے باغیوں نے 1910 میں کمان سنبھالی اور 1940 میں مہاراشٹر میں وری بغاوت ہوئی۔ بیرسا کی قیادت والی تحریک بھی ایسی ہی ایک بغاوت تھی۔

بیرسا منڈا

بیرسا انیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں پیدا ہوا۔ وہ ایک غریب باپ کا بیٹا تھا جو بوہنڈا کے جنگلوں میں بھیڑیں چراتے، بانسری بجاتے اور مقامی اکھاڑوں میں رقص کرتے ہوئے پروان چڑھا۔ غربت کی وجہ سے اس کا باپ کام کی تلاش میں ایک جگہ سے دوسری جگہ بھٹکتا رہتا تھا۔ نوجوانی کے زمانہ میں وہ ماضی میں ہوئے منڈاؤں کی سرکشی کے بارے میں سنتا اور اپنے قبیلے کے سرداروں کو انقلاب کی تحریک دیتے ہوئے دیکھتا تھا۔ وہ اس سنہرے زمانے کو یاد کرتے تھے جب منڈا قبائل ڈیکوں کے دباؤ سے آزاد تھے، اور وہ اس زمانے کا تصور کرتے تھے جب ان کے قبیلے کے موروثی حقوق انھیں پھر حاصل ہو جائیں گے۔ وہ اپنے کو علاقے کے اصل باشندوں کا وارث خیال کرتے ہوئے آزادی کے لیے لڑ رہے تھے اور اپنی حکومت کو دوبارہ حاصل کرنے کی لوگوں کو تحریک دے رہے تھے۔

بیرسا مقامی مشنری اسکول جاتا اور مشنریوں کے وعظ سنتا۔ وہاں بھی اس نے وہی سنا

ماخذ 3

'خون میرے کندھوں سے رستا رہا'

منڈا کے گیتوں سے ان کی بے پناہ تکالیف کا اظہار ہوتا تھا۔

افسوس ! یہ حقیر جبری بیگاری
خون میرے کندھوں سے رس رہا ہے
دن اور رات زمیندار کا کارندہ مجھے
غصہ دلاتا اور چڑچڑاہٹ میں مبتلا
کرتا ہے،
دن اور رات میں کراہتا رہتا ہوں
افسوس! یہ میری حالت
میرا کوئی گھر بھی نہیں جہاں مجھے خوشی
حاصل ہو
افسوس!

کے۔ ایس سنگھ کی تصنیف بیرسا منڈا اور اس کی تحریک، صفحہ 12

کہ منڈاؤں کے لیے آسمانی بادشاہت اور اپنے کھوئے ہوئے حقوق حاصل کرنا ممکن ہے، لیکن یہ اسی وقت ممکن ہوگا جب وہ برے کام کرنا چھوڑ دیں اور اچھے عیسائی بن جائیں۔ اس کے بعد بیرسا نے کچھ وقت ایک **ویشنوی** مبلغ کے ساتھ گزارا۔ اس نے جنیو پہنا اور طہارت اور تقدس کی اہمیت کو سمجھنا شروع کر دیا۔

ویشنو – وشنو کی پوجا کرنے والا

آنے والے برسوں میں بیرسا ان بہت سے خیالات سے متاثر ہوا جن سے اس کا سابقہ پڑا۔ اس کی تحریک قبائلی سماج کی اصلاح کی تحریک تھی۔ اس نے منڈا قبائلیوں پر زور دیا کہ وہ شراب پینا چھوڑ دیں، گاؤں کو صاف ستھرا رکھیں، جادو پر اعتقاد ختم کر دیں اور سفلی اعمال کرنا ترک کر دیں۔ لیکن ہمیں اپنے ذہنوں میں یہ بات بھی رکھنی چاہیے کہ بیرسا عیسائی مشنریوں اور ہندو زمینداروں کے خلاف بھی ہو گیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ یہ بیرونی طاقتیں منڈاؤں کی طرز زندگی برباد کر رہی ہیں۔

1895 میں بیرسا نے اپنے پیروؤں پر زور دیا کہ وہ اپنے شاندار ماضی کو واپس لے آئیں۔ وہ ماضی کے ایک ایسے سنہرے دور کی بات کرتا تھا جو ستیہ یگ (سچائی کا دور) تھا، اور جب منڈا اچھی زندگی بسر کرتے تھے، ندیوں پر گھاٹ بناتے تھے۔ قدرتی چشموں سے فائدہ اٹھاتے تھے، درخت اگاتے اور پھولوں کی کیاریاں تیار کرتے تھے اور زندگی گزارنے کے لیے کھیتیاں کرتے تھے۔ وہ اپنے بھائیوں اور رشتہ داروں کو ہلاک نہیں کرتے تھے۔ وہ ایمانداری سے زندگی گذارتے تھے بیرسا یہ بھی چاہتا تھا کہ لوگ پھر اپنی زمینوں پر کام کریں، ایک جگہ بسیں اور اپنے کھیتوں میں کام کریں۔

برطانوی اہل کاروں کو جس چیز نے پریشانی میں ڈال رکھا تھا وہ بیرسا کی سیاسی تحریک تھی۔ یہ تحریک عیسائی مبلغین، مہاجنوں، ہندو زمینداروں اور حکومت کو وہاں سے نکال دینا اور بیرسا کی سرداری میں ایک مُنڈا راج قائم کرنا چاہتی تھی۔ یہ تحریک اپنی تمام پریشانیوں اور دکھوں کا سبب انھیں طاقتوں کو سمجھتی تھی۔ انگریزوں کا زمینی بندوبست ان کے روایتی زمینی نظام کو برباد کر رہا تھا۔ ہندو زمیندار اور ساہوکار ان کی زمینیں ہڑپ رہے تھے اور عیسائی مبلغین ان کے روایتی تہذیب پر تنقید کر رہے تھے۔

یہ تحریک جیسے ہی عام ہوئی برطانوی اہل کاروں نے فوراً اس پر روک لگانے کا فیصلہ

کیا۔انھوں نے 1895 میں بیرسا کو گرفتار کرلیا اور فساد کا الزام لگا کر اسے دو سال کے لیے جیل میں ڈال دیا۔

جب 1897 میں بیرسا رہا ہوا تو اس نے عوامی تائید حاصل کرنے کے لیے گاؤں میں گشت کرنا شروع کر دیا۔ وہ لوگوں کو ابھارنے کے لیے روایتی علامات اور زبان استعمال کرتا اور زور دیتا کہ وہ راون (دیکو اور یورُپین) کو تباہ کر دیں اور اس کی سربراہی میں ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالیں۔ بیرسا کے ماننے والوں نے دیکو اور یوروپی طاقتوں کی علامات کو نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ انھوں نے پولیس تھانوں اور گرجا گھروں پر حملے کیے اور ساہوکاروں اور زمینداروں کی جائدادوں کو تباہ کرنا شروع کر دیا۔ انھوں نے بیرسا راج قائم کرنے کے لیے سفید پرچم بلند کیا۔

1900 میں بیرسا کی ہیضے میں موت ہو جانے سے یہ تحریک دم توڑ گئی۔ لیکن اس نے اپنے اثرات دو طرح سے چھوڑے ایک یہ کہ اس نے نوآبادیاتی حکومت کو ایسے قوانین بنانے پر مجبور کر دیا جس سے دیکو آدی واسیوں کی زمینیں آسانی سے ہڑپ نہ سکیں۔ دوسرے یہ کہ اس نے قبائلیوں کی طاقت بھی ظاہر کر دی کہ وہ ناانصافیوں کے خلاف احتجاج اور سامراجی حکومت کے خلاف ناراضگی کا اظہار کر سکتے ہیں۔ یہ کام انھوں نے خالصتاً اپنے طور پر انجام دیا انھوں نے جدوجہد کے لیے اپنے رسوم اور اپنی ہی علامات استعمال کیں۔

دوسری جگہوں پر

ہمیں نقدی کی ضرورت کیوں پڑتی ہے!

قبائلی اور دوسرے سماجی گروپ بازار کے لیے اشیا کیوں نہیں تیار کرنا چاہتے تھے اس کے کئی اسباب ہیں۔ پاپوانیوگنی کے قبائلیوں کا یہ گیت ہمیں یہ بتاتا ہے کہ قبائلی مارکیٹ کو کس نظر سے دیکھتے تھے۔

ہم کہتے ہیں کہ نقدی غیر اطمینان بخش
پت جھڑ ہے؛
یہ بارش کو نہیں روکے گی
اور یہ میرے لیے تکلیف دہ ہے
پھر میں کیوں اپنی صلاحیتوں کو کام میں لاؤں
ناریل کے درختوں سے
ان سرکاری کیڑوں مکوڑوں کے لیے
نقدی پیدا کرنا تو بہت ہی اچھا ہے
بشرط کہ بیچنے کے لیے آپ کے پاس کچھ ہو
لیکن محترم یہ بتلائیے کہ
اگر خریدنے کے لیے کچھ نہ ہو؛
تو پریشانی اٹھانے کا فائدہ؟

کوہن، کلارک اور ہاسویل کی مرتبہ
اکانومی آف سبسیسٹینس ایگری کلچر،
(1970) سے ایک گیت کا کچھ حصہ

دوہرائیے

1۔ خالی جگہوں کو پر کیجیے:

(a) انگریز قبائلی لوگوں کو ________ کہتے تھے۔

(b) جھوم طریقہ کاشت میں بیج ڈالنے کو ________ کہا جاتا تھا۔

(c) برطانیہ کے زمینی بندوبست میں وسطی ہندوستان کے قبائلی سرداروں کو ________ خطاب دیا گیا تھا۔

(d) آدی واسی آسام میں ________ میں اور بہار میں ________ کام کرنے گئے تھے۔

2۔ بتائیے کہ صحیح ہے یا غلط۔

(a) جھوم کاشت کار زمین پر ہل چلاتے اور بیج بوتے تھے۔

(b) تاجر سنتھالیوں سے ریشم کے کوئے خریدتے تھے اور پانچ گنا زیادہ قیمت پر بیچتے تھے۔

(c) بیرسا نے اپنے پیروؤں سے کہا کہ خود کو پاک صاف رکھو، شراب نہ پیو اور جادو ٹونے پر یقین نہ کرو۔

(d) برطانوی قبائلی طریقۂ زندگی کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔

آئیے تصور کریں

تصور کیجیے کہ آپ انیسویں صدی کے ایک جنگل میں گاؤں کے جھوم کاشت کار ہیں۔ اچانک آپ کو اطلاع دی گئی کہ یہ زمین جہاں آپ پیدا ہوئے تھے، اب آپ کی نہیں ہے۔ برطانوی اہل کاروں کی ایک میٹنگ میں آپ درپیش مسائل کی وضاحت کر رہے ہیں۔ آپ کیا کہیں گے؟

گفتگو کیجیے

3۔ گشتی کاشت کاروں کو برطانوی حکومت میں کیا مشکلات پیش آتی تھیں؟

4۔ نوآبادیاتی حکومت میں قبائلی سرداروں کے اختیارات میں کیا تبدیلی آئی؟

5۔ دیکوؤں کے خلاف قبائلیوں کے غم وغصہ کے کیا اسباب تھے؟

6۔ بیرسا کا سنہرے عہد کے بارے میں کیا تصور تھا؟ آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ تصور علاقوں کے لوگوں کو کیوں متاثر کرتا تھا؟

کر کے دیکھیے

7۔ اپنے والدین، دوستوں اور اساتذہ سے بیسویں صدی کے دوسرے قبائل کے پیروؤں کے بارے میں دریافت کیجیے۔ ان کی کہانی اپنے الفاظ میں لکھیے۔

8۔ ہندوستان میں بسنے والے آج کے کسی ایک آدی واسی گروپ کی طرز زندگی کو چن لیجیے اور بتائیے کہ پچھلے پچاس سالوں میں ان کی زندگیوں میں کیا تبدیلیاں آئیں۔

4824CH05

5

جب عوام بغاوت کرتی ہے

1857 اور اس کے بعد

شکل 1 – سپاہی اور کسان اس بغاوت کے لیے طاقت اکٹھا کرتے ہوئے۔یہ بغاوت 1857 میں شمالی ہندوستان کے میدانوں میں پھیل گئی تھی

پالیسیاں اور عوام

پچھلے ابواب میں آپ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی پالیسیوں اور مختلف افراد پر پڑنے والے ان کے اثرات کا مطالعہ کیا۔ راجے، رانیاں، کسان، زمیندار، آدی واسی اور سپاہی سب ان پالیسیوں سے الگ الگ متاثر ہوئے۔ آپ نے یہ بھی دیکھا کہ لوگ اپنے مفاد یا جذبات کے خلاف پالیسیوں اور کارروائیوں کا مقابلہ کس طرح کرتے تھے۔

نوابوں نے اپنے اختیارات کھودیے

اٹھارھویں صدی کے وسط ہی سے نوابوں اور راجاؤں نے اپنی طاقت کو ختم ہوتے ہوئے دیکھا۔ انھوں نے اپنے اختیارات اور اپنی عظمت کھودی۔ بہت سے درباروں میں ریزیڈنٹ

بٹھا دیے گئے، حکمرانوں کے اختیارات میں کمی کر دی گئی۔ ان کی فوج پر پابندی عائد کر دی گئی اور بتدریج ان کے محاصل اور حدود مملکت پر قبضہ کر لیا گیا۔

کئی حکمراں خاندانوں نے اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے کمپنی سے مصالحت کی کوشش کی۔ مثال کے طور پر جھانسی کی رانی لکشمی بائی نے اپنے شوہر کی وفات کے بعد گود لیے ہوئے بیٹے کو وارث کے طور پر قبول کیے جانے کی خواہش کی۔ پیشوا باجی راؤ دوم کے متبنیٰ نانا صاحب نے اپنے والد کے انتقال کے بعد ان کی پنشن اپنے نام جاری کیے جانے کے حق میں دلائل دیے۔ لیکن کمپنی نے اپنی برتری اور فوجی قوت کے زعم میں ان درخواستوں کو ٹھکرا دیا۔

الحاق کی جانے والی ریاستوں میں اودھ سب سے آخری ریاست تھی۔ 1801 میں اس کے ساتھ اتحاد کا عہد کیا گیا اور بالآخر 1856 میں اس پر قبضہ کر لیا گیا۔ گورنر جنرل ڈلہوزی نے اعلان کیا کہ ریاست میں بدانتظامی کا دور دورہ ہونے کی وجہ سے حسن انتظام کی خاطر انگریزوں کی حکومت وہاں ضروری ہو گئی ہے۔

کمپنی اب مغلیہ خاندان کو ختم کرنے کی تدبیریں کرنے لگی۔ کمپنی کے ڈھالے ہوئے سکوں پر سے مغل بادشاہ کا نام مٹا دیا گیا۔ 1849 میں گورنر جنرل ڈلہوزی نے اعلان کیا کہ بہادر شاہ ظفر کے انتقال کے بعد شاہی خاندان کو لال قلعے سے بے دخل کر دیا جائے گا اور دہلی میں ہی کسی دوسری جگہ ان کو بسا دیا جائے گا۔ 1856 میں گورنر جنرل کیننگ نے فیصلہ کیا کہ بہادر شاہ ظفر کی موت کے بعد بادشاہت ختم کر دی جائے گی اور اس کے وارثین صرف شہزادے کہلائیں گے۔

کسان اور سپاہی

گاؤں میں کسان اور زمیندار زبردست ٹیکسوں اور وصول یابی کے انتہائی سخت طریقوں کے خلاف نفرت کا اظہار کر رہے تھے۔ ان میں سے بہت سے لوگ ساہوکاروں کو اپنا قرض واپس نہ کر پانے کی وجہ سے اپنی آبائی زمینوں سے بتدریج بے دخل کر دیے گئے۔

کمپنی سے ہندوستانی سپاہیوں کی بے اطمنانی کے بھی اسباب تھے۔ وہ اپنی تنخواہ، بھتہ اور ملازمت کی شرائط سے خوش نہیں تھے۔ کچھ نئے قوانین ان کے مذہبی عقائد کے خلاف تھے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ اس زمانہ میں بہت سے ہندوستانی اس بات پر یقین رکھتے تھے

سرگرمی

تصور کیجیے کہ آپ کمپنی کی فوج کے ایک سپاہی ہیں اور اپنے بھتیجے کو فوج کی ملازمت سے روکنا چاہتے ہیں۔ آپ اسے کون سے دلائل دیں گے؟

کہ اگر انھوں نے سمندری سفر کیا تو اپنا مذہب اور اپنی ذات کھو بیٹھیں گے ؟ اس لیے 1824 میں جب انھیں حکم دیا گیا کہ سمندری سفر کر کے برما جائیں اور کمپنی کے لیے جنگ کریں تو انھوں نے انکار کر دیا اگر چہ وہ اس کام کے لیے بری سفر کرنے پر راضی تھے۔ انھیں سخت سزا دی گئی، لیکن چوں کہ یہ تحریک ختم نہیں ہوئی اس لیے کمپنی نے 1856 میں یہ قانون نافذ کیا کہ کمپنی کی فوج کے ہر ملازم کو بطور شرط یہ رضامندی دینی ہوگی کہ وہ حسب ضرورت سمندر پار بھی اپنے فرائض انجام دے گا۔

عوام پر جو کچھ گزر رہی تھی اس کا ردعمل بھی سپاہیوں پر ہو رہا تھا۔ ان میں بہت سے کسان تھے جن کے بال بچے دیہاتوں میں رہتے تھے اس لیے کسانوں کا غصہ جلد ہی فوجی سپاہیوں تک پھیل گیا۔

شکل 2– شمالی ہندوستان کے ایک بازار میں سپاہی آپس میں خبروں اور افواہوں کا تبادلہ کرتے ہوئے۔

اصلاحات کا نتیجہ

انگریزوں کا یقین تھا کہ ہندوستانی سماج میں اصلاح کی ضرورت ہے۔ اس لیے ستی کی رسم کو ختم کرنے اور بیواؤں کی دوبارہ شادی کو رائج کرنے کے لیے قوانین بنائے گئے۔ انگریزی زبان کی تعلیم کو پرجوش طریقے سے پھیلایا گیا۔ 1830 کے بعد عیسائی مبلغین کو مملکت میں آزادانہ کام کرنے، زمین اور جائداد خریدنے کا حق دیا گیا۔ 1850 میں ایک اور نئے قانون کے ذریعہ عیسائیت قبول کرنے کو آسان بنایا گیا۔ اس قانون کے تحت عیسائیت قبول کرنے والے کو اپنے آبائی جائداد کی وراثت کا حق دار ٹھہرایا گیا۔ اس کی وجہ سے بہت سے ہندوستانی یہ محسوس کرنے لگے کہ برطانوی حکومت ان کے مذہب، سماجی رسوم اور روایتی طرز زندگی کو تباہ کرنے کے درپے ہے۔ یقیناً کچھ ہندوستانی ایسے بھی تھے جو موجودہ سماجی ڈھانچے میں تبدیلی کے حامی تھے۔ آپ ان مصلحین اور ان کی اصلاحی تحریکات کے بارے میں ساتویں باب میں پڑھیں گے۔

لوگوں کی نگاہوں سے

اس زمانہ میں لوگ برطانوی حکومت کے بارے میں کیا سوچتے تھے یہ جاننے کے لیے آپ ماخذ 1 اور 2 پر نگاہ ڈالیے۔

2019-20

ماخذ 1

چوراسی قوانین کی فہرست

ذیل میں مہاراشٹر کے کسی گاؤں کے ایک برہمن وشنو بھٹ گوڈ سے کی کتاب ماجھاپرواس (میرا سفر) سے کچھ اقتباسات دیے جارہے ہیں۔ وہ اور اس کا چچا ایک یگیہ (Yajna) میں شرکت کے لیے متھرا روانہ ہوئے۔ وشنو بھٹ لکھتا ہے کہ راستے میں اس کی ملاقات کچھ سپاہیوں سے ہوئی جنھوں نے ان لوگوں کو آگے بڑھنے سے روک دیا کیوں کہ تین دنوں میں ایک عظیم بغاوت ہونے والی تھی۔ سپاہی نے کہا:

> انگریزوں نے تہیہ کر رکھا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہب کو مٹا کر دم لیں گے .... انھوں نے چوراسی قوانین کا ایک مجموعہ تیار کیا ہے اور اس کا اعلان کلکتہ کے ایک مجمع میں کیا ہے جس میں تمام راجا اور شہزادے جمع تھے۔ انھوں نے بتایا کہ بادشاہوں (راجاؤں) نے ان قوانین کو ماننے سے انکار کر دیا ہے اور انگریزوں کو خبردار کیا ہے کہ اگر ان قوانین کا نفاذ کیا گیا تو عوامی شورش ہوگی جس کے نتائج خطرناک ہوں گے اور یہ بھی کہ تمام بادشاہ انتہائی غصے میں اپنے ریاستی دارالسلطنت کو واپس ہو گئے ہیں تمام بڑے لوگوں نے ایک پلان بنالیا ہے۔ اس کے لیے ایک تاریخ طے کر لی گئی ہے اور میرٹھ کی فوجی چھاؤنی سے تمام فوجی چھاؤنیوں کو خفیہ خطوط روانہ کر دیے گئے ہیں۔

وشنو بھٹ گوڈ سے، ماجھاپرواس، صفحہ 24-23

جب سرکشی عوامی بغاوت بن جاتی ہے

اگر چہ حکمرانوں اور محکوموں کے درمیان کشمکش کوئی نئی چیز نہیں لیکن کبھی کبھی یہ کشمکش بڑھ کر عوامی تحریک بن جاتی ہے اور حکومت کا اختیار ختم ہو جاتا ہے۔ لوگوں کی اکثریت کو اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ ان سب کا ایک مشترک دشمن ہے اس لیے وہ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ ایسے حالات پیدا کرنے کے لیے لوگوں کو متحد رہنا پڑتا ہے، مواصلاتی ربط برقرار رکھنا ہوتا ہے اور گرد و پیش کے حالات پر قابو رکھنے کے لیے مکمل اعتماد کا بھی اظہار کرنا ہوتا ہے۔

ایسی ہی صورت حال 1857 میں شمالی ہندوستان میں پیدا ہوگئی۔ سو سالہ فتوحات اور اقتدار کے بعد اب ایسٹ انڈیا کمپنی ایک عمومی بغاوت کا سامنا کر رہی تھی جو مئی 1857 میں شروع ہوئی اور اس نے ہندوستان میں کمپنی کے وجود کو خطرے میں ڈال دیا۔ میرٹھ سے شروع ہونے والی بغاوت کئی مقامات پر پھیل گئی اور سماج کے مختلف طبقے بغاوت پر اتر

سرکشی – جب فوجی اجتماعی طور سے اپنے افسروں کی حکم عدولی کرتے ہیں۔

ماخذ 2

''جلد ہی ہر رجمنٹ میں جوش پیدا ہو گیا''

ایک دوسرا ذریعہ علم اس زمانے کا ہمارے پاس صوبے دار سیتارام پانڈے کی یادداشتوں کی شکل میں ہے۔ سیتارام پانڈے 1812 میں بنگال کی مقامی فوج میں ایک سپاہی کی حیثیت سے بھرتی ہوا تھا۔ اس نے 48 سال انگریزوں کی ملازمت کی اور 1860 میں ریٹائر ہوا۔ اس نے بغاوت کے کچلنے میں انگریزوں کی مدد کی اگرچہ اس کا لڑکا خود باغیوں میں شامل تھا اور اس کی آنکھوں کے سامنے انگریزوں کی گولیوں کا شکار ہوا تھا۔ سبکدوشی کے بعد اپنے کمانڈنگ افسر نورگیٹ کے اصرار پر اس نے اپنی یادداشت مرتب کی۔ اس نے اپنی تحریر کو 1861 میں اودھی زبان میں مکمل کیا جس کا ترجمہ نورگیٹ نے انگریزی زبان میں کر کے سپاهی سے صوبے دار تک کے نام سے شائع کیا۔

سیتارام پانڈے کی تحریر کا ایک اقتباس یہ ہے:

> یہ میری عاجزانہ رائے ہے کہ اودھ کی اس تسخیر نے سپاہیوں میں بداعتمادی پیدا کی اور حکومت کے خلاف سازش کرنے پر آمادہ کیا۔ نواب اودھ اور دہلی کے بادشاہ کے ایجنٹ پورے ہندوستان کے فوجیوں کے ذہن کا پتہ لگانے کے لیے بھیجے گئے۔ انھوں نے فوجیوں کے جذبات کو بیدار کیا کہ ان بیرونی لوگوں نے ہمارے بادشاہ کے ساتھ کتنی ظالمانہ دھوکہ بازی کی ہے۔ انھوں نے ہزاروں جھوٹی باتیں بنائیں اور جھوٹے وعدے کیے تاکہ سپاہی اپنے مالکوں یعنی انگریزوں سے غداری پر آمادہ ہو جائیں اور بادشاہ کو دہلی کا تخت واپس دلانے کا ان کا مقصد پورا ہو۔ ان سفیروں نے یہ بات زور دے کر کہی کہ اگر فوجی متحد رہیں اور ہدایتوں کی پابندی کریں تو فوج کے لیے ایسا کرنا بالکل ممکن ہے۔
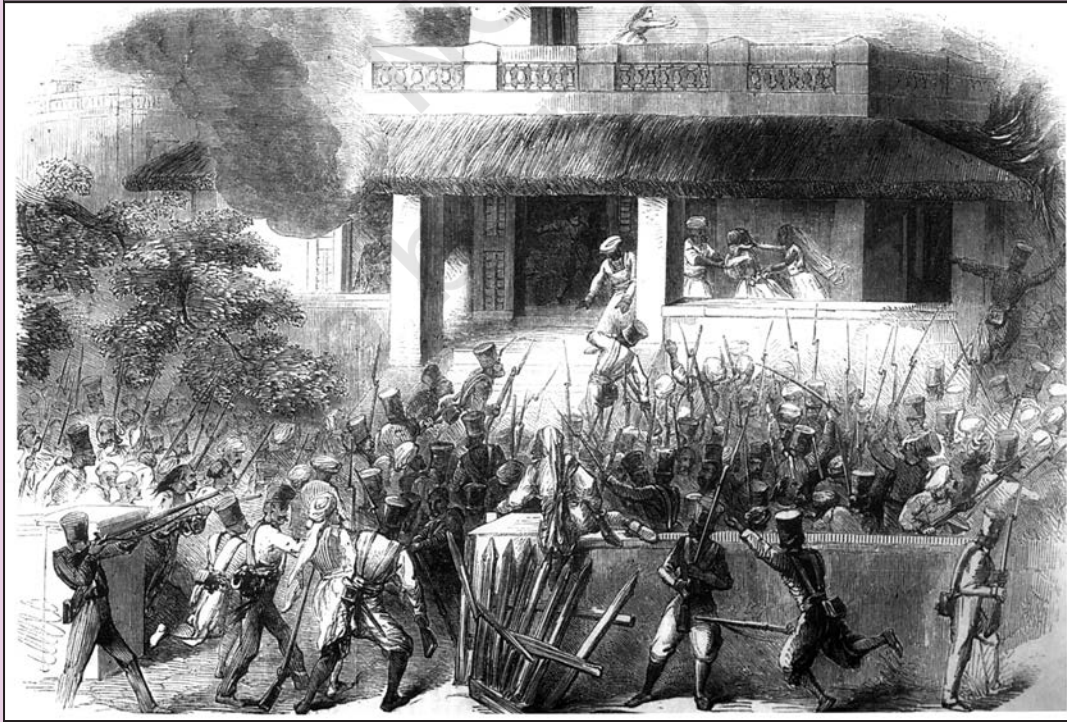
شکل 3 – میرٹھ کے باغی سپاهی اپنے افسروں پر حملہ آور ہوتے، ان کے گھروں میں گھس جاتے اور عمارتوں میں آگ لگا دیتے۔

2019-20

ماخذ 2 کا بقیہ

یہ اتفاق تھا کہ ایسے ہی نازک وقت میں سرکار نے ہر رجمنٹ سے مختلف توپ خانوں میں نئی رائفلوں کے بارے میں ہدایات دے کر آدمی بھیجے۔ انھوں نے بطور نمونہ کچھ دنوں تک فوجیوں سے اس کی مشق کروائی یہاں تک کہ کسی نہ کسی طرح یہ خبر پھیل گئی کہ نئے کارتوس گائے اور سور کی چربی سے آلودہ ہیں۔ ہماری رجمنٹ کے کچھ لوگوں نے دوسرے رجمنٹ کے لوگوں کو اس بارے میں لکھا اور اس طرح جلد ہی ہر رجمنٹ میں ایک جوش پیدا ہو گیا۔ کچھ لوگوں نے یہ بات کہی کہ پچھلے چالیس برسوں میں سرکار نے لوگوں کے مذہبی جذبات سے ایسا کھلواڑ کبھی نہیں کیا لیکن جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں اودھ کے انضمام نے لوگوں کے ذہنوں کو مسموم کر دیا تھا۔ دل چسپی رکھنے والی پارٹیوں نے فوراً ہی یہ بات پھیلا دی کہ انگریزوں کا اصل مقصد لوگوں کو عیسائی بنانا تھا۔ اسی لیے انھوں نے ایسے کارتوس پھیلائے جس کے استعمال سے مسلمان اور ہندو دونوں نجس ہو جاتے ہیں۔

کرنل صاحب کا اب بھی یہی خیال تھا کہ وہ جوش و خروش جس کا مشاہدہ وہ اپنی آنکھوں سے کر چکے تھے، پہلے ہی کی طرح ٹھنڈا ہو جائے گا اس لیے انھوں نے مشورہ دیا کہ میں گھر چلا جاؤں۔

سیتا رام پانڈے، سپاہی سے صوبے دار تک، صفحہ 163-162

سرگرمی

1۔ سیتا رام اور وشنو بھٹ کے مطابق لوگوں کے ذہن میں کون سے اہم تصور رہے ہوں گے؟

2۔ ان کے خیال میں حکمرانوں نے کیا کردار ادا کیے؟ سپاہی کون سا کردار ادا کرتے نظر آتے تھے؟

آئے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ انیسویں صدی کا پوری دنیا میں سامراجیت کے خلاف یہ سب سے بڑا اہتھیار بند مقابلہ تھا۔

میرٹھ سے دہلی تک

29 مارچ 1857 کو منگل پانڈے نامی ایک سپاہی کو بارک پور میں اپنے افسروں پر حملہ کرنے کے جرم میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ اس کے کچھ دن بعد میرٹھ چھاؤنی کے چند سپاہیوں نے نئے کارتوسوں کے ساتھ جن کے بارے میں شبہ تھا کہ انھیں گائے اور سور کی چربی سے آلودہ کیا گیا ہے، پریڈ کرنے سے انکار کر دیا۔ 85 سپاہی، افسروں کی حکم عدولی کی پاداش میں ملازمت سے برخاست کر دیے گئے اور انھیں دس سال کی سزا سنا دی گئی۔ یہ واقعہ 9 مئی 1857 کا ہے۔

فرنگی – غیر ملکی کو حقارت سے فرنگی کہا جاتا تھا۔

میرٹھ میں دوسرے ہندوستانی فوجیوں کا ردعمل غیر معمولی ہوا۔ 10 مئی کو سپاہی مارچ

شکل 4 – کیولری لائنس کی جنگ
3 جولائی 1857 کی شام کو 3,000 سے زیادہ باغی بریلی سے آکر، جمنا پار کر کے دہلی میں داخل ہو گئے اور برطانوی گھوڑسوار چوکی پر حملہ کر دیا۔ یہ جنگ رات بھر جاری رہی۔

کرتے ہوئے جیل گئے، قیدی سپاہیوں کو چھڑا لیا اور برطانوی افسروں پر حملہ کر کے قتل کر دیا۔ انھوں نے بندوقوں اور ہتھیاروں پر قبضہ کیا، انگریزوں کے مکانات اور ان کی جائداد کو آگ لگا دی اور فرنگیوں کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ ان فوجیوں نے عہد کر لیا تھا کہ ملک سے ان کی حکومت ختم کر دیں گے۔ لیکن پھر ملک پر حکومت کون کرے گا؟ فوجیوں کے پاس جواب تیار تھا — مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر۔

میرٹھ کے سوار سپاہی ساری رات چل کر دوسرے دن صبح سویرے دہلی پہنچ گئے۔ ان کے آنے کی خبر پہنچتے ہی دہلی میں متعین پلٹنیں بھی بغاوت کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں، برطانوی افسران یہاں بھی مار ڈالے گئے۔ ہتھیاروں اور جنگی ساز و سامان پر قبضہ کیا گیا اور مکانوں کو آگ لگا دی گئی۔ فتحیاب سپاہی لال قلعے کی دیوار کے اطراف جہاں بادشاہ کی قیام گاہ تھی، جمع ہو گئے اور بادشاہ سے ملنے کا مطالبہ کیا۔ شہنشاہ برطانیہ جیسی عظیم طاقت کو چیلنج کرنے کے لیے تیار نہیں تھا لیکن سپاہی اصرار کرتے رہے یہاں تک کہ وہ محل میں زبردستی داخل ہو گئے اور بہادر شاہ ظفر کو اپنا رہنما بنانے کا اعلان کر دیا۔

بوڑھے بادشاہ کو یہ مطالبہ تسلیم کرنا پڑا۔ اس نے ملک کے تمام حکمرانوں اور بااختیار افراد کو خطوط لکھے کہ آگے بڑھ کر تمام ریاستوں کا ایک وفاق تشکیل دیں تاکہ انگریزوں سے جنگ کی جا سکے۔ بادشاہ کے اس ایک کام کے نتائج بہت دور رس رہے۔

2019-20

مغلیہ خاندان نے ملک کے ایک بڑے حصے پر حکومت کی تھی۔ چھوٹے حکمراں اور سردار مختلف علاقوں کو بادشاہ کے نمائندوں کی حیثیت سے کنٹرول کرتے تھے۔ برطانوی حکومت کی بڑھتی ہوئی وسعت سے خوف زدہ ہوکر ان میں سے اکثر کو یہ خیال ہوا کہ اگر مغل حکمرانی دوبارہ واپس آجائے تو ہم اس کے زیر سایہ اپنے علاقوں میں پھر سے حکومت کر سکتے ہیں۔

برطانویوں کو اتنا کچھ ہو جانے کا اندیشہ نہیں تھا۔ ان کا خیال تھا کہ کارتوس کا مسئلہ بالآخر ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ لیکن بہادر شاہ ظفر کی سرپرستی کے اس فیصلے نے ڈرامائی طور سے صورت حال تبدیل کردی۔ لوگوں کو جب کوئی متبادل ملتا ہے تو وہ اس کے حاصل کرنے میں پر جوش ہو جاتے ہیں۔ اس سے انھیں حوصلہ، امید اور اعتماد حاصل ہوتا ہے۔

بغاوت پھیل جاتی ہے

دہلی سے انگریزوں کا صفایا ہو جانے کے بعد تقریباً ایک ہفتہ تک خاموشی رہی۔ اتنا وقت تو خبر کے پھیلنے میں لگا۔ اس کے بعد بغاوتوں کا ایک سیلاب امڈ آیا۔ پلٹن پر پلٹن باغی ہوتی گئی اور وہ دوسرے باغیوں کے ساتھ شامل ہونے کے لیے اہم مراکز جیسے دہلی، کانپور اور لکھنؤ میں جمع ہونے لگیں۔ انھیں کے پیچھے قصبوں اور دیہاتوں کے لوگ بھی بغاوت پر اتر آئے اور مقامی لیڈروں، زمینداروں اور مکھیاؤں کے گرد جو اپنا اختیار قائم کرنے اور انگریزوں کا مقابلہ کرنے کے خواہش مند تھے، جمع ہو گئے۔ کانپور کے قریب مقیم آنجہانی پیشوا باجی راؤ کے متبنیٰ نانا صاحب نے مسلح فوجیوں کی مدد سے برطانوی توپ خانے کو شہر سے خارج کر دیا اور خود کو پیشوائی کے منصب پر فائز کیا۔ اس نے اعلان کیا کہ وہ شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کے ماتحت ایک گورنر ہے۔ لکھنؤ میں معزول واجد علی شاہ کے بیٹے برجیس قدر کو نواب بنا دیا گیا۔ اس نے بھی بہادر شاہ کی ماتحتی قبول کی۔ اس کی ماں بیگم حضرت محل نے انگریزوں کے خلاف مورچہ لینے

شکل 5 - جیسے ہی بغاوت پھیلی برطانوی افسران چھائونیوں میں قتل کر دیے گئے۔

سرگرمی
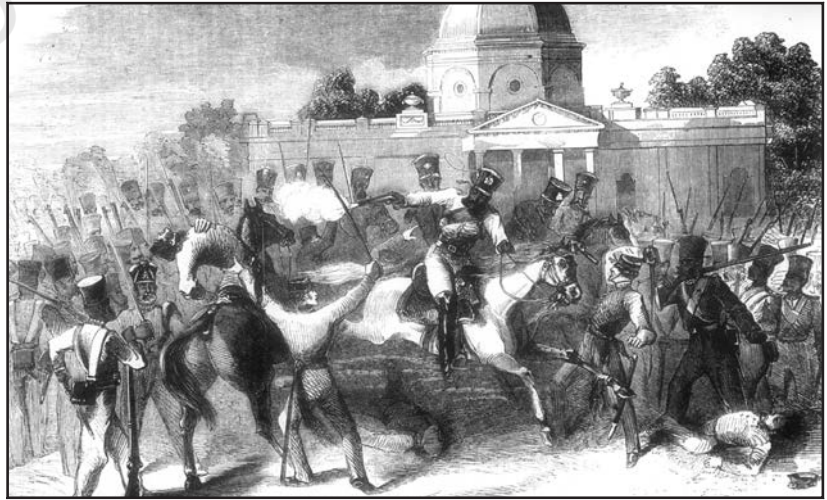
1۔ مغل شہنشاہ نے باغیوں کی مدد کرنا کیوں قبول کیا؟

2۔ اس نے سپاہیوں کی پیش کش کو قبول کرنے سے پہلے جو تجزیہ کیا ہوگا اس کے بارے میں ایک پیراگراف لکھیے۔

میں اہم کردار ادا کیا۔ جھانسی میں رانی لکشمی بائی نے باغیوں کا ساتھ دیا اور نانا صاحب کے جنرل تانتیا ٹوپے کے ساتھ مل کر انگریزوں سے جنگ کی۔ مدھیہ پردیش کے منڈلا علاقے میں رام گڑھ کی رانی اونتی بائی نے بغاوت کی اور چار ہزار فوجیوں کی قیادت کرتے ہوئے انگریزوں کے خلاف جنگ کی جنھوں نے اس کی ریاست کا انتظام اپنی نگرانی میں لے لیا تھا۔

انگریز باغیوں کے بہ نسبت تعداد میں بہت کم تھے۔ انھیں بہت سی جنگوں میں شکست ہوئی۔ اس کی وجہ سے لوگوں کو یقین ہو گیا کہ برطانوی اقتدار ختم ہو چکا ہے۔ اس سے انھیں اور حوصلہ ہوا کہ باغیوں کے ساتھ مل کر جنگ میں شریک ہو جائیں۔ اودھ میں خصوصی طور سے اور پورے ملک میں عمومی طور سے بغاوت شروع ہو گئی۔ لفٹننٹ کرنل ٹائٹلر کا اپنے کمانڈر ان چیف کو بھیجا ہوا 6 اگست 1857 کا ایک تار ہمیں ملا ہے جس میں انگریزوں پر منڈلاتے ہوئے خطرات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ''ہمارے آدمی مخالفین کی کثرت تعداد اور مسلسل جنگوں سے مغلوب ہو چکے ہیں۔ ہر قریہ اور ہر گاؤں ہمارے خلاف ہے اور زمیندار ہمارے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔''

بہت سے نئے لیڈر بھی سامنے آئے۔ مثال کے طور پر مولوی احمد اللہ شاہ فیض آبادی جنھوں نے پیشین گوئی کی تھی کہ انگریزوں کی حکومت جلد ہی ختم ہو جائے گی۔ انھوں نے لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی اور ایک جم غفیر اپنے گرد اکٹھا کر لیا۔ وہ انگریزوں سے لڑنے کے لیے لکھنؤ آئے۔ دہلی میں بہت سے مجاہدین انگریزوں کا قلع قمع کرنے کے لیے جمع ہوئے۔ بریلی کا ایک سپاہی بخت خان ایک بڑی فوج جمع کر کے دہلی پہنچا۔ یہ باغی فوجوں کا بڑا سالار بن گیا۔ بہار میں کنور سنگھ نام کے ایک بوڑھے زمیندار نے باغی سپاہیوں کا ساتھ دیا اور کئی مہینوں تک انگریزوں سے لڑتا رہا۔ تمام ملک کے جنگجو اور قومی رہنما جنگ میں شریک ہو گئے۔

کمپنی جوابی حملہ کرتی ہے

اس زبردست خلفشار میں بھی کمپنی نے اپنے اوسان بحال رکھے اور آخر کار اس نے پوری قوت سے بغاوت کو کچل دینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے انگلینڈ سے مزید فوجیں منگوائیں۔ ایسے نئے قوانین بنائے جن سے باغیوں کو باآسانی سزا دی جا سکے۔ پھر کمپنی بغاوت کے خاص مراکز پر چڑھ دوڑی۔ دہلی پر ستمبر 1857 میں دوبارہ قبضہ کر لیا گیا۔ آخری مغل شہنشاہ
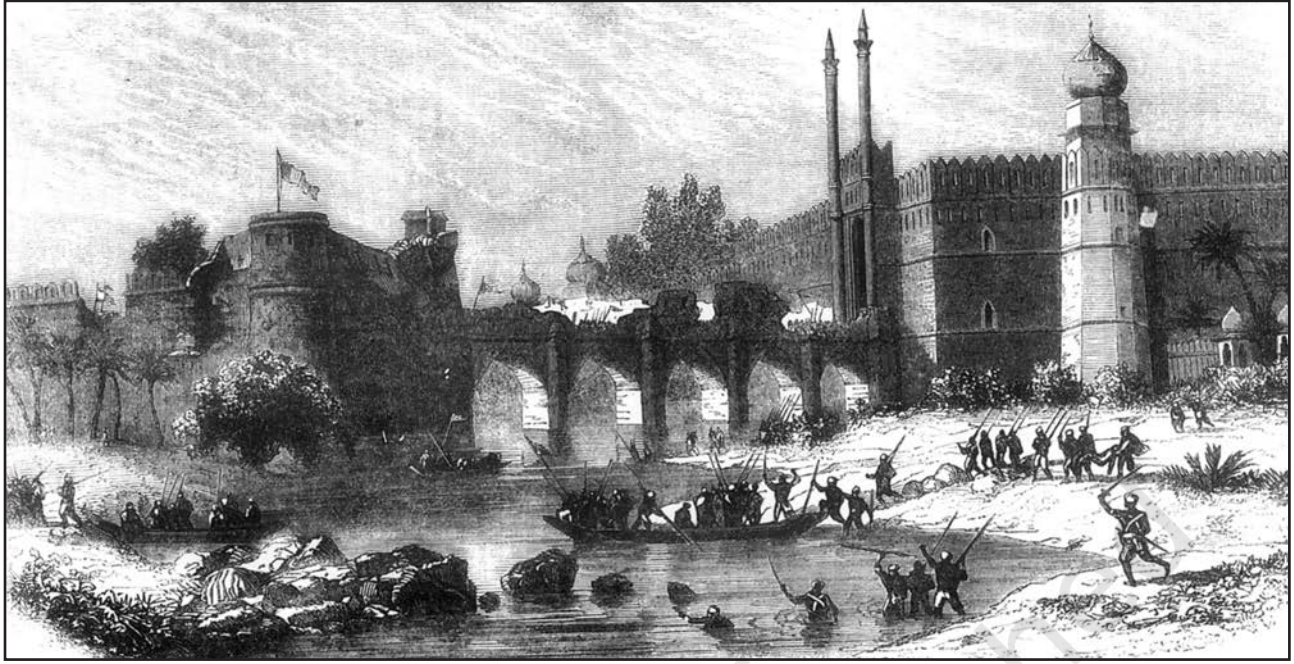
شکل 6 – برطانوی فوجیں باغیوں پر حملے کرتے ہوئے جنھوں نے لال قلعہ (دائیں) اور سلیم گڑہ قلعہ (بائیں) پر قبضہ کر رکھا تھا

بہادر شاہ ظفر پر مقدمہ چلایا گیا اور عمر قید کی سزا دی گئی۔ اکتوبر 1858 میں اسے اور اس کی اہلیہ بیگم زینت محل کو رنگون جیل بھیج دیا گیا۔ نومبر 1862 میں بہادر شاہ ظفر کا رنگون جیل میں ہی انتقال ہو گیا۔

دہلی پر دوبارہ قبضہ کا مطلب بہر حال یہ نہیں تھا کہ اس کے بعد بغاوت ختم ہو گئی۔ عوام انگریزوں سے مقابلہ کرتی رہی اور جنگ بھی جاری رہی۔ برطانیہ کو اس زبردست عوامی بغاوت کو کچلنے میں دو سال لگ گئے۔

لکھنؤ پر مارچ 1858 میں قبضہ کر لیا گیا۔ رانی لکشمی بائی جون 1858 میں شکست کھا کر مقتول ہوئی۔ یہی صورت حال رانی اونتی بائی کے ساتھ رونما ہوئی جس نے کھیری میں فتح حاصل کرنے کے بعد چاروں طرف برطانوی فوجوں سے گھر جانے پر موت کو گلے لگانا بہتر سمجھا۔ تانتیا ٹوپے وسطی ہند کے جنگلات میں فرار ہو گیا اور بہت سے قبائلی اور کسان سرداروں کی مدد سے گوریلا جنگ لڑتا رہا۔ آخر کار وہ گرفتار ہوا، اس پر مقدمہ چلایا گیا اور اپریل 1859 میں اسے بھی مار دیا گیا۔

جس طرح انگریزوں کے خلاف فتوحات نے باغیوں کے حوصلے بلند کیے تھے ویسے ہی باغی طاقتوں کی شکست نے وفاداری تبدیل کرنے کو بھی بڑھاوا دیا۔ انگریزوں نے بھرپور کوشش کی کہ لوگوں کی وفاداریاں دوبارہ حاصل کر لیں۔ انھوں نے وفادار

سرگرمی

ان مقامات کی ایک فہرست تیار کیجیے جہاں مئی، جون اور جولائی 1857 میں شورش برپا ہوئی تھی۔

شکل 7 - حصار شکن ٹرین دهلی پہنچتی هے
شروع میں برطانوی فوج کے لیے دهلی کی مضبوط قلعه بندی کو توڑنا مشکل ثابت هوا لیکن 3 ستمبر 1857 کو امداد آپہنچی۔ یه ایک سات میل لمبی حصار شکن ٹرین تهی، جس میں بیل گاڑیوں پر توپیں اور گوله بارود تها، جسے هاتهی کهینچتے تهے

زمینداروں کو اپنی زمینوں پر روایتی قبضہ جاری رکھنے کو بطور انعام بحال رکھنے کا اعلان کیا۔ ان باغیوں کو جنھوں نے اطاعت قبول کر لی تھی اگر ان کے ہاتھ کسی سفید فام کے خون سے رنگے ہوئے نہیں تھے کہا گیا کہ وہ محفوظ رہیں گے اور زمینوں پر ان کے حقوق بھی سلب نہیں کیے جائیں گے۔ اس کے باوجود سیکڑوں سپاہیوں، باغیوں، نوابوں اور راجاؤں کے خلاف مقدمہ چلایا گیا اور انھیں پھانسی دی گئی۔

شکل 8 – برطانوی فوجیوں نے دهلی میں داخل هونے کے لیے کشمیری دروازے کو بارود سے اڑا دیا

2019-20
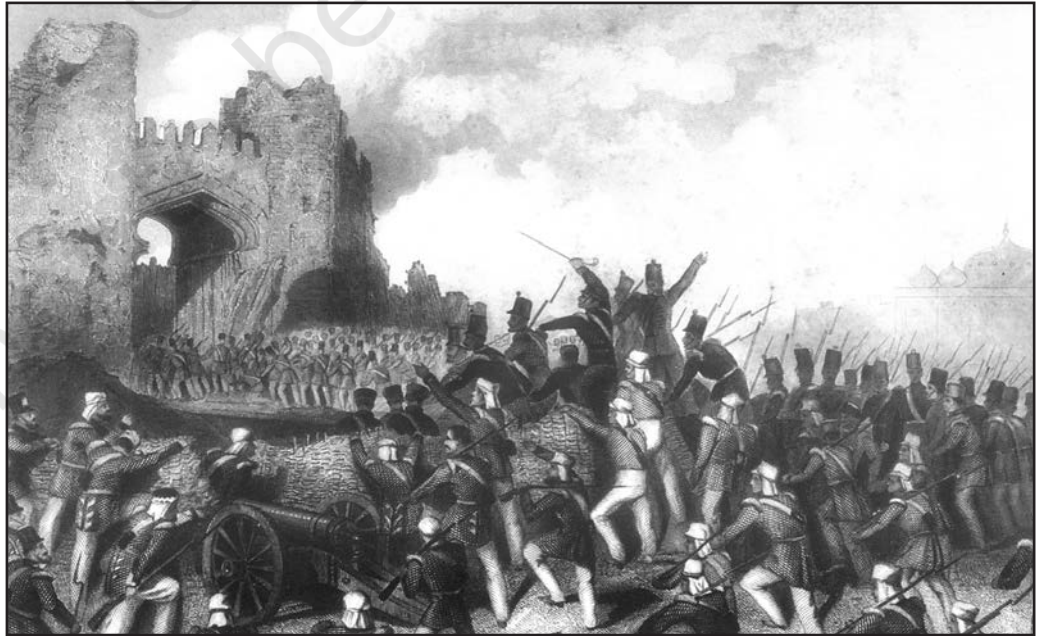
طوفان کے بعد

انگریزوں نے 1859 کے آخر تک پورے ملک پر دوبارہ کنٹرول حاصل کرلیا لیکن اب وہ پرانی پالیسیوں کے ساتھ یہاں مزید حکومت نہیں کرسکتے تھے۔
کچھ اہم تبدیلیاں جو انگریزوں نے نافذ کیں درج ذیل ہیں:

1۔ برطانوی پارلیمنٹ نے 1858 میں ایک نیا ایکٹ پاس کیا اور ہندوستانی انتظامیہ کو زیادہ سے زیادہ ذمہ دار بنانے کی خاطر ایسٹ انڈیا کمپنی کے اختیارات تاج برطانیہ کے حوالہ کردیے۔ برطانوی مجلس وزرا کا ایک رکن، سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا، مقرر کیا گیا اور اسے ہندوستان میں حکومت کرنے سے متعلق تمام معاملات کا ذمہ دار بنا دیا گیا۔ انڈیا کونسل کے نام سے اسے مشورہ دینے کے لیے ایک کونسل کی تشکیل دی گئی۔ ہندوستان کے گورنر جنرل کو وائسرائے کا خطاب دیا گیا گویا کہ وہ تاج برطانیہ کا براہ راست نمائندہ ہے۔ ان طریقوں سے برطانوی حکومت نے ہندوستان پر براہ راست حکومت کرنے کی ذمہ داری قبول کرلی۔

شکل 9– برطانوی فوج کانپور میں باغیوں کو قید کرتے ہوئے
دیکھیے مصور نے کس طرح باغی فوجوں پر انگریز سپاہیوں کی بہادرانہ پیش قدمی کو اجاگر کیا ہے۔

2۔ ریاستی سربراہوں کو یقین دلایا گیا کہ مستقبل میں ان کی حدود مملکت کو کبھی ضم نہیں کیا جائے گا۔ ان کی حکومت ان کے وارثوں یا متبنیٰ کو حاصل رہے گی لیکن انھیں ملکۂ برطانیہ کو مقتدر اعلیٰ تسلیم کرنا پڑے گا۔ اس طرح ہندوستانی والیانِ ریاست تاجِ برطانیہ کے ماتحت حکمراں قرار پائے۔

3۔ فیصلہ کیا گیا کہ فوج میں ہندوستانی سپاہیوں کا تناسب کم اور برطانوی سپاہیوں کا تناسب بڑھا دیا جائے گا۔ یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ بجائے اودھ، بہار، وسطی ہندوستان اور جنوبی ہندوستان کے گورکھا، سکھ اور پٹھانوں میں سے زیادہ سپاہی بھرتی کیے جائیں گے۔

4۔ مسلمانوں کی زمینیں اور جائداد بڑے پیمانہ پر ضبط کی گئیں اور ان کے ساتھ شک وشبہ اور دشمنوں کا سا سلوک کیا گیا، انگریزوں کو یقین تھا کہ بغاوت کی ذمہ داری ان پر

بہت زیادہ عائد ہوتی ہے۔

5۔ برطانیہ نے فیصلہ کیا کہ روایتی مذاہب اور سماجی رسوم کا احترام کیا جائے گا۔

6۔ مالکان زمین اور زمینداروں کے تحفظ اور زمین پر ان کے مالکانہ حقوق کے تحفظ کی پالیسی اپنائی جائے گی۔

اس طرح 1857 کے بعد تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوا۔
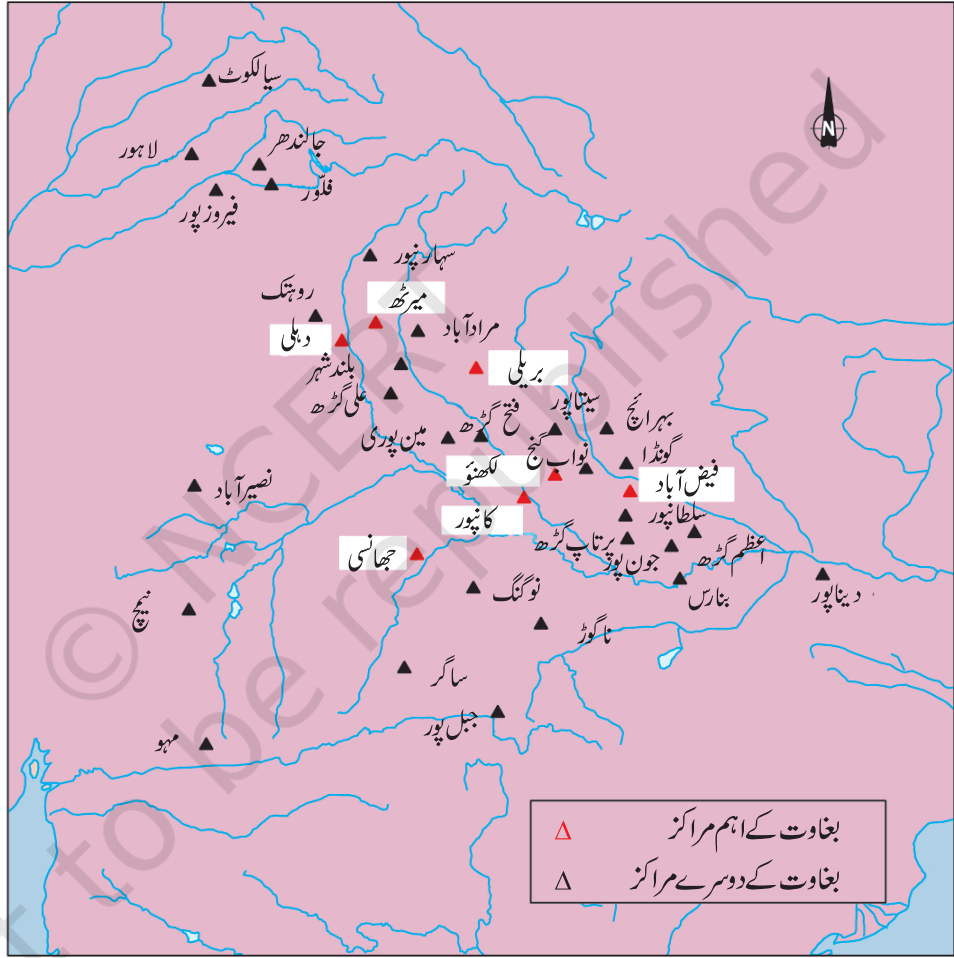
شکل 10– شمالی ہندوستان میں بغاوت کے کچھ اہم مراکز

2019-20

دوسری جگہوں پر

امن کی آسمانی سلطنت کے لیے

شکل 11– تائی پنگ کی فوج اپنے رہنما سے ملاقات کرتی ہوئی

جس وقت 1857 میں ہندوستان میں بغاوت پھیل رہی تھی، اسی وقت چین میں بھی ایک زبردست عوامی سرکشی سرابھار رہی تھی۔ یہ تحریک 1850 میں شروع ہوئی اور اسے 1860 کے وسط تک دبایا جاسکا۔ ہزاروں غریب مزدور ہانگ زیوقوان (Xiu qu an) کی سربراہی میں جنگ کرنے اور امن کی عظیم آسمانی سلطنت قائم کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اسے تائی پنگ بغاوت کا نام دیا گیا۔

ہانگ زیوقوان ایک نیا عیسائی تھا جو چین کے روایتی مذاہب مثلاً کنفیوشین ازم اور بدھ مت کے خلاف تھا۔ تائی پنگ کے باغی ایک ایسی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے جہاں ایک نئے طرز کے عیسائیت کا دوردورہ ہو، جہاں کسی کی نجی جائداد نہ ہو، جہاں سماجی نابرابری اور مرد وزن کے درمیان تفریق نہ ہو اور جہاں افیون، تمباکو، شراب اور دوسرے کام جیسے جوا، قحبہ گری اور غلامی وغیرہ ممنوع ہوں۔

برطانیہ اور فرانس کی مسلح فوجوں نے جو اس وقت چین میں متحرک تھیں، تائی پنگ بغاوت کو کچلنے میں قینگ خاندان کے شہنشاہ کی مدد کی۔

آئیے تصور کریں

فرض کیجیے کہ آپ بغاوت کے دوران اودھ میں ایک برطانوی افسر ہیں۔ آپ اپنے باغیوں سے جنگ کرنے کے منصوبہ کو کس طرح بالکل خفیہ رکھیں گے؟

دوہرائیے

1۔ جھانسی کی رانی لکشمی بائی کا کیا مطالبہ تھا جسے انگریزوں نے ٹھکرا دیا تھا؟

2۔ انگریزوں نے عیسائیت اختیار کرنے والوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے کیا کیا؟

3۔ نئے کارتوسوں کے استعمال کا حکم دیے جانے پر سپاہیوں کے کیا اعتراضات تھے؟

4۔ مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر نے اپنے آخری ایام کیسے گزارے؟

گفتگو کیجیے

5۔ مئی 1857 سے قبل برطانوی حکمرانوں کے ہندوستان میں اپنی پوزیشن پر اعتماد کرنے کے کیا اسباب ہو سکتے تھے؟

6۔ بہادر شاہ ظفر کے باغیوں کو تعاون دینے کے حکمراں خاندانوں پر کیا اثرات مرتب ہوئے؟

7۔ انگریز اودھ کے باغی زمینداروں کی اطاعت حاصل کرنے میں کیسے کامیاب ہوئے؟

8۔ 1857 کی بغاوت کے بعد انگریزوں نے اپنی پالیسی کیسے تبدیل کی؟

کر کے دیکھیے

9۔ اپنے علاقے کے لوگوں اور اپنے اہل خاندان کو سن ستاون کی لڑائی کے بارے میں جو قصے یا گیت یاد ہوں انھیں تلاش کیجیے۔ اس عظیم شورش کے بارے میں کون سی یادیں لوگوں کو عزیز ہیں؟

10۔ رانی لکشمی بائی کے بارے میں مزید معلومات حاصل کیجیے وہ کن طریقوں سے اپنے وقت کی ایک غیر معمولی خاتون بن سکی؟

شکل 12– لکھنؤ ریزیڈنسی کے کھنڈرات
جون 1857 میں باغی طاقتوں نے ریزیڈنسی کا محاصرہ شروع کر دیا۔ وہاں کی عمارتوں میں انگریز عورتوں، مردوں اور بچوں کی کثیر تعداد پناہ لیے ہوئی تھی۔
باغیوں نے چہار دیواری کا محاصرہ کر لیا اور عمارتوں پر گولہ باری شروع کر دی۔ انھیں عمارتوں کے ایک کمرہ میں اودھ کے چیف کمشنر ہنری لارنس کی ایک گولے سے موت ہوگئی۔
دیکھیے کہ عمارتوں میں گزشتہ واقعات کی کیا کیا نشانیاں موجود ہیں۔

4824CH06

6 بُنکر، آہن گر اور فیکٹری مالکان

شکل *1* – ساتویں صدی میں سورت کی بندرگاہ پر تجارتی جہازوں کا منظر

گجرات کے مغربی ساحل پر واقع شہر سورت ہندوستان کی بحری تجارت کی سب سے اہم بندرگاہوں میں سے ایک تھا۔ ابتدائی سترھویں صدی سے اس بندرگاہ کو انگریز اور ڈچ جہازوں نے استعمال کرنا شروع کردیا تھا لیکن اٹھارھویں صدی میں اس کی اہمیت کم ہوگئی۔

اس باب میں برطانوی راج میں ہندوستان کی صنعتوں اور دستکاریوں کی کہانی بیان کی گئی ہے اور دو صنعتوں یعنی پارچہ بافی (Textiles) اور لوہا وفولاد (Iron and Steel) پر خاص طور پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ جدید دنیا میں صنعتی انقلاب کے لیے یہ دونوں صنعتیں بڑی اہم تھیں۔ مشینوں کے ذریعے سوتی کپڑوں کی پیداوار نے برطانیہ کو انیسویں صدی کی سب سے اہم صنعتی قوم بنادیا۔ 1850 کی دہائی سے جب لوہے اور فولاد کی صنعت بڑھنی شروع ہوئی تو برطانیہ کو ''کارگاہِ جہان'' یا دنیا کی ورکشاپ کہا جانے لگا۔

برطانیہ کی صنعت کاری کا ہندوستان پر برطانیہ کی فتح اور نوآبادیات کے قیام سے تعلق تھا۔ آپ باب 2 میں پڑھ چکے ہیں کہ انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی مفادات کس طرح ہندوستانی علاقوں پر قبضے کی شکل میں ظاہر ہوئے اور پھر کس طرح آئندہ دہائیوں میں تجارت کا پورا ڈھرّا ہی بدل گیا۔ اٹھارھویں صدی کے آخر میں کمپنی

ہندوستان سے چیزیں خریدتی تھی اور انھیں انگلینڈ اور یورپ میں برآمد کرتی تھی اور اس طرح ان کی فروخت سے منافع کماتی تھی۔ جیسے جیسے صنعتی پیداوار میں اضافہ ہوا برطانوی صنعت کاروں نے محسوس کیا کہ ہندوستان ان کی صنعتی پیداوار کے لیے ایک بڑی منڈی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ برطانیہ کے تیار شدہ مال کا ہندوستان میں سیلاب سا آ گیا۔ ان باتوں کا ہندوستان کی صنعتوں اور دستکاریوں پر کیا اثر پڑا؟ اس باب میں ہم اسی سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔

ہندوستانی کپڑا اور عالمی منڈی

پہلے ہم کپڑے کی پیداوار پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ 1750 کے لگ بھگ جب برطانیہ نے بنگال کو فتح نہیں کیا تھا اس وقت ہندوستان دنیا میں سوتی کپڑے کی سب سے زیادہ پیداوار کرنے والا ملک تھا۔ ایک زمانے سے ہندوستانی کپڑے اپنی نفاست، خوبی، عمدہ کوالٹی اور اعلیٰ قسم کی کاریگری کے لیے مشہور تھے۔ جنوب مشرقی ایشیا (جاوا، ساترا اور پنانگ) اور مغربی اور وسطی ایشیا میں ان کی بڑی پیمانے پر تجارت ہوتی تھی۔ یوروپی تجارتی کمپنیوں نے یوروپ میں بیچنے کے لیے سولھویں صدی سے ہی ہندوستانی کپڑوں کی خریداری شروع کردی تھی۔ ہندوستانی بنکروں کی کاریگری اور ہندوستان کی شاندار تجارت کی یادیں انگریزی اور دوسری زبانوں کے خوبصورت لفظوں میں آج بھی محفوظ ہیں۔ ان الفاظ کے ماخذ پتہ لگانا اور یہ دیکھنا کہ یہ الفاظ کیا کہتے ہیں، دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔

شکل 2 – پٹولا کی بنائی، انیسویں صدی کے وسط میں

پٹولا سورت، احمد آباد اور پٹن میں بُنا جاتا تھا۔ انڈونیشیا میں اس کی بڑی قیمت تھی اور اسی لیے یہ وہاں کی بنائی کی مقامی روایت کا ایک حصہ بن گیا تھا۔

الفاظ میں تاریخ پوشیدہ ہے

یوروپی تاجروں کا سب سے پہلا واسطہ اس اعلیٰ سوتی کپڑے (ململ) سے پڑا جو عرب تاجر ہندوستان سے موصَل لے جاتے تھے (موصل آج کل عراق میں ہے)۔ اسی لیے اس

2019-20

کپڑے کو انھوں نے 'مَسلِن' (Muslin) کا نام دیا۔ اس لفظ نے بڑا رواج پایا۔ جب پرتگالی لوگ مسالوں کی تلاش میں پہلی بار ہندوستان آئے تو وہ جنوب مغربی ہندوستان میں کیرالہ کے ساحل پر واقع کالی کٹ میں اترے۔ وہ مسالوں کے ساتھ ساتھ جو سوتی کپڑا یوروپ لے گئے اسے 'کالی کوٗ' (Calico) کہا جاتا تھا۔ لفظ 'کالی کوٗ' کالی کٹ سے ماخوذ تھا اور پھر یہ تمام سوتی کپڑوں کے لیے ایک عام لفظ بن گیا۔

ایسے اور بھی الفاظ ہیں جو مغربی بازاروں میں ہندوستانی کپڑوں کی مقبولیت ظاہر کرتے ہیں۔ شکل 3 میں آپ ایک آرڈر بک کا صفحہ دیکھیں گے جو 1730 میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے کلکتے میں اپنے نمائندوں کو بھیجا تھا۔

List of Goods to be Provided in the Bay of Bengall for the Ships going out in the Year 1730.

		Pieces	£	Ton
Addaties	of low Prices, Six thousand Pieces	6000	2200	8 4/7
Ditto	Fine, with Gold Heads, Three thousand	3000	1500	4 2/7
Alliballies	low Prices, Five hundred	500	650	1 1/4
Baftaes	of low Prices, Eighteen Yards long, Six thousand	6000	1875	13 1/2
Ditto	very fine with Gold heads, Fifteen hundred	1500	625	3 3/4
Ditto Jugdea	of Twelve Yards long such as receiv'd by the Heathcote, Ten thousand	10000	3625	18 3/4
Bandanoes	or Taffa de Foolas, as by the Eyles, Six thousand	6000	3072	7 1/2
Carridarries	very good, such as the Fine Bale by the Heathcote (or else none) One thousand	1000	483	1 2/3
Carridarries	Sannoes, One thousand	1000	470	1 2/3
Chillaes	of the same goodness as the finest that came by the Heathcote, Three thousand	3000	750	5
Chowtars	of the low Price Sort, as by the Heathcote, Four thousand	4000	1060	6 2/3
Cooptees	Two thousand	2000	880	3 1/3
Chints Patna	as directed last Year, Thirty thousand, and that Twenty thousand of them be glazed, and the following Chints in proportion	30000	12000	73 3/4
Ditto Cossimbuzar	Ten thousand	10000	812	14
Ditto Calcutta	as Orderd last Year, Six thousand	6000	1254	6
Cuttannees	Atlass Plain, well Coverd, and good variety of Stripes and Colours, One thousand	1000	700	1 1/4
Ditto	Striped and Flowerd, also well Coverd, Five hundred	500	500	5/8
Cossaes	Fine, Yard and half broad, with Gold heads, at least as good as those by the Heathcote, Four thousand	4000	7000	10
Ditto	of an inferiour Sort, better than the Heathcote, Six thousand	6000	6000	15
Ditto	Fine, Yard and three eighths broad with Gold head, better than the Heathcote, Two thousand	2000	4000	5
Ditto	of an inferiour Sort, Two thousand	2000	1750	5
Ditto Orua	Yard and eighth to Yard and three sixteenths broad, Fifteen thousand	15000	12750	37 1/2
Ditto	Yard broad, of the Lowest Prices, Eight thousand	8000	4440	20
Ditto Chantpoore	Yard broad as by the Heathcote, Two thous.	2000	4000	5
Ditto	of the same Fabrick of a lower Sort, Two thousand	2000	2500	5

Cossaes Sorry

شکل 3 – ایسٹ انڈیا کمپنی کی آرڈر بک کا ایک صفحہ، 1730

غور کیجیے کہ لندن میں آرڈر بک میں ہر چیز کی قیمت کتنی احتیاط سے درج کی گئی ہے۔ یہ آرڈر دو سال پیشتر دیے جاتے تھے کیوں کہ ہندوستان کو آرڈر بھیجنے، مطلوبہ کپڑوں کو تیار کرانے اور جہازوں کے ذریعے مال برطانیہ تک پہنچنے میں اتنا ہی وقت درکار رہتا تھا۔ جب کپڑے کے تھان لندن پہنچ جاتے تو ان کو نیلامی کے ذریعے فروخت کر دیا جاتا تھا۔

اُس سال کپڑے کے 5,89,000 تھانوں کا آرڈر تھا۔ اس آرڈر بک کے سرسری مطالعے سے آپ کو سوتی اور ریشمی کپڑوں کی اٹھانوے اقسام کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہے۔ یہ کپڑا یوروپی تجارت میں 'پیس گڈس' (Peice Goods) کے نام سے جانا جاتا تھا۔ کپڑے کے یہ تھان عام طور پر 20 گز لمبے اور ایک گز چوڑے ہوتے تھے۔

شکل 4 – جام دانی بُنائی، بیسویں صدی کے اوائل میں
جام دانی ایک نفیس قسم کی ململ ہوتی تھی جس پر کرگھے کے ذریعے سفید اور بھورے رنگ کے نقش ونگار بنائے جاتے تھے۔ یہ کام عام طور پر سوٹ اور زردوزی کا ملا جلا ہوتا تھا جیسا کہ تصویر میں دیے گئے کپڑے کے نمونے سے ظاہر ہے۔ بنگال میں ڈھاکہ اور صوبۂ متحدہ میں لکھنؤ جام دانی کی بنائی کے اہم مراکز تھے۔

اب ذرا کتاب میں دیے گئے کپڑوں کی اقسام کے نام دیکھیے۔ جس قسم کے کپڑوں کے تھانوں کا آرڈر بڑے پیمانے پر دیا جاتا تھا وہ چھپے ہوئے سوتی کپڑے ہوتے تھے جنھیں چنٹز (Chintz)، کوسا (Cossaes) یا خاصّہ (khassa) اور بندنا (Bandanna) کہا جاتا تھا۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ انگریزی لفظ چنٹز کہاں سے آیا ہے؟ یہ ہندی لفظ چھینٹ سے بنا ہے یعنی ایسا کپڑا جس پر چھوٹے چھوٹے پھولدار نقش ونگار ہوں۔ 1680 کی دہائی سے انگلینڈ اور یوروپ میں ہندوستان کے چھپے ہوئے سوتی کپڑوں کا بڑا شوق پیدا ہو گیا تھا اور اس ذوق وشوق کی وجہ ان کپڑوں کے نفیس پھولدار ڈیزائن اور اعلیٰ بُناوٹ کے علاوہ یہ بھی تھی کہ یہ نسبتاً سستے ہوتے تھے۔ انگلینڈ کے دولت مند لوگ اور خود ملکۂ برطانیہ بھی ہندوستان کے بنے ہوئے کپڑے پہنتی تھیں۔
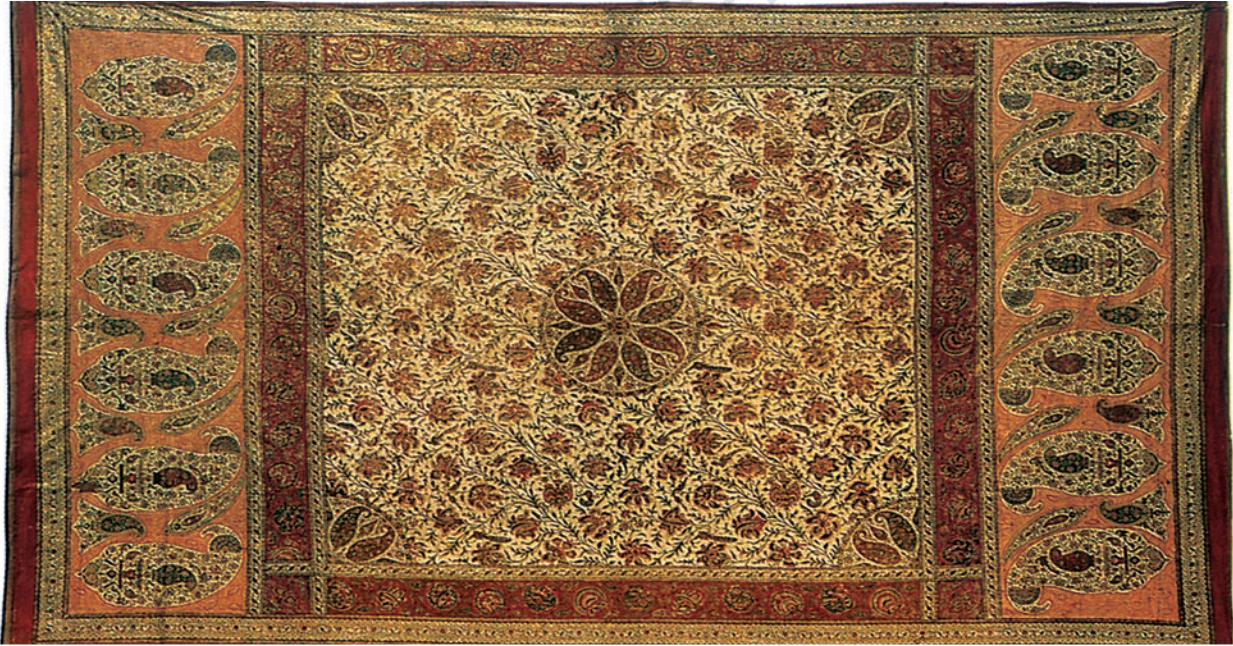
شکل 5 – نفیس کپڑے پر چھپے ڈیزائن (چنٹز) جو انیسویں صدی کے وسط میں مسولی پٹنم (آندھرا پردیش) میں تیار ہوتا تھا
یہ اس قسم کی چنٹز کا اعلیٰ نمونہ ہے جو ایران اور یوروپ کو برآمد کرنے کے لیے تیار ہوتی تھی۔

اسی طرح لفظ بندنا (Bandanna) آج ہر قسم کے گہرے رنگین اور چھپے ہوئے اسکارف کے لیے استعمال ہوتا ہے جسے گلے اور سر پر باندھنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ بنیادی طور پر یہ کہ ہندوستانی لفظ 'بندھن' (Bandhna) سے نکلا ہے اور اس سے مراد مختلف اقسام کے وہ شوخ رنگ کپڑے ہوتے تھے جن کی رنگائی باندھ کر کی جاتی تھی۔

آرڈر بک میں دیگر کپڑوں کا بھی ذکر ہے جو اپنے علاقوں قاسم بازار، پٹنہ، کلکتہ، اڑیسہ، چار پور کے ناموں سے مشہور تھے، بڑے پیمانے پر ان الفاظ کا استعمال اس بات کا مظہر ہے کہ ہندوستانی کپڑے دنیا کے مختلف حصوں میں کس قدر مقبول تھے۔
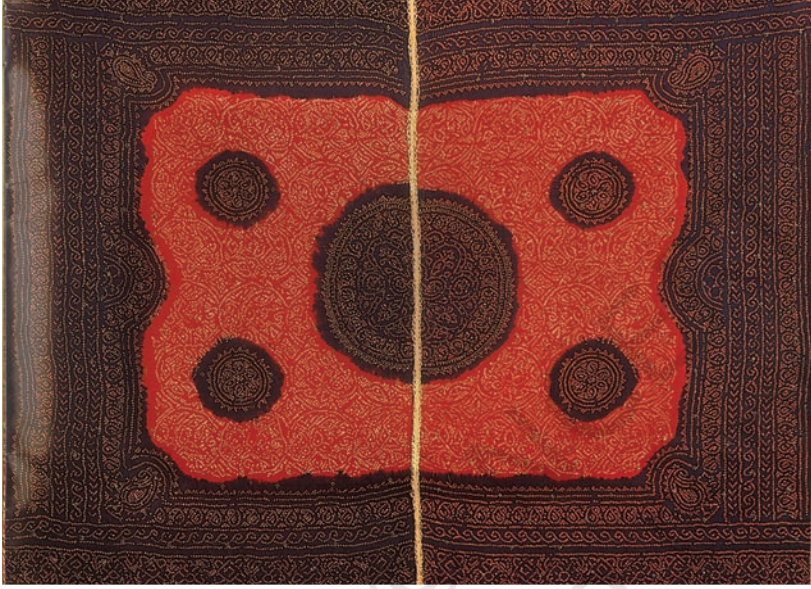
شکل 6 – بیسویں صدی کے اوائل میں بندنا ڈیزائن

درمیان سے ہو کر گزرنے والی لکیر کو دیکھیے۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ اس اوڑھنی میں بندھائی، رنگائی والے دو ریشمی کپڑے زردوزی کے دھاگے سے باہم سلے ہوئے ہیں۔ بندھن والے نمونے اکثر راجستھان اور گجرات میں تیار ہوتے تھے۔

یوروپ کے بازاروں میں ہندوستانی کپڑے

اٹھارھویں صدی کے اوائل سے ہی ہندوستانی کپڑوں کی مقبولیت سے پریشان ہو کر انگلینڈ کے اون اور ریشم تیار کرنے والوں نے ہندوستانی کپڑوں کی درآمد کے خلاف احتجاج شروع کر دیا۔ 1720 میں برطانوی حکومت نے ایک ایکٹ پاس کر کے انگلینڈ میں چھپے ہوئے سوتی کپڑے — چنٹز — کے استعمال پر پابندی لگا دی۔ دلچسپ بات یہ رہی کہ اس ایکٹ کو کالی کو ایکٹ (Calico Act) کہا گیا۔

اسی زمانے میں انگلینڈ کے اندر کپڑے کی صنعت کا ارتقا شروع ہوا۔ چوں کہ انگلینڈ کی کپڑا صنعت ہندوستانی کپڑوں سے مقابلہ نہیں کر سکتی تھی اس لیے انگریز صنعت کار یہ چاہتے تھے کہ انگلینڈ میں ہندوستانی کپڑے کا داخلہ روک کر اندرون ملک منڈی کو اپنے

دیسی مال کے لیے محفوظ کرلیں۔ کالی کو چھپائی وہ پہلی صنعت تھی جو سرکاری تحفظ کے تحت وجود میں آئی۔ اب سفید ململ یا سادہ کورے ہندوستانی کپڑے پر ہندوستانی ڈیزائین کی نقل اوراُن کی چھپائی کی جانے لگی۔

ہندوستانی کپڑے سے مقابلہ آرائی کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ انگلینڈ میں تکنیکی ایجادات کی کوششیں شروع ہوگئیں۔ 1764 میں جان کے (John Kaye) نے سوت کاتنے کی ایک مشین **اسپننگ جینی** (Spinning Jenny) ایجاد کی۔ جس سے روایتی تکلوں کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ ہوگیا۔ 1786 میں رچرڈ آرک رائٹ (Richard Arkwright) نے جب بھاپ کا انجن ایجاد کیا تو سوتی کپڑوں کی بُنائی میں انقلاب پیدا ہوگیا اور بہت کم لاگت میں بڑی مقدار میں کپڑے کی بُنائی ممکن ہوگئی۔

بہرحال اٹھارھویں صدی کے خاتمے تک ہندوستانی کپڑا عالمی تجارت پر چھایا رہا۔ یوروپ کی تجارتی کمپنیوں —ڈچ، فرانسیسی اور برطانوی— نے اس پھلتی پھولتی تجارت سے بہت نفع کمایا۔ یہ کمپنیاں ہندوستان میں چاندی درآمد کرکے یہاں سے سوتی اور ریشمی کپڑا خریدتی تھیں لیکن جیسا آپ باب 2 میں پڑھ چکے ہیں کہ جب انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی کو بنگال میں سیاسی طاقت حاصل ہوگئی تو پھر انھیں ہندوستانی سامان خریدنے کے لیے قیمتی دھات درآمد کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ اس کے بجائے انھوں نے ہندوستان میں زمینداروں اور کسانوں سے محصول اکٹھا کیا اور اس محصول کو ہندوستانی کپڑے کی خریداری میں استعمال کیا۔

سرگرمی

آپ کے خیال میں اس ایکٹ کو کالی کو ایکٹ (Calico Act) کیوں کہا گیا؟ اس نام سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس ایکٹ سے کس قسم کے کپڑے پر پابندی لگانی مقصود تھی؟

اسپننگ جینی (Spinning Jenny)– یہ ایک مشین تھی جس کے ذریعے ایک کاریگر کئی تکلوں کو ایک ساتھ چلا سکتا تھا۔ جب پہیے کو گھمایا جاتا تھا تو تمام تکلے گھومنے لگتے تھے۔

شکل 7 –کوچین میں ایک ڈچ بستی کا سمندری منظر، سترھویں صدی
جب یوروپ کی تجارت میں توسیع ہوئی تو مختلف بندرگاہوں پر تجارتی بستیاں قائم ہوگئیں۔ سترھویں صدی کے اندر کوچین میں ڈچ بستیاں وجود میں آگئیں تھیں۔ بستی کے چاروں طرف قلعہ بندی پر غور کیجیے۔

اٹھارھویں صدی کے آخر میں کپڑا بنائی کے اہم مراکز کہاں تھے؟
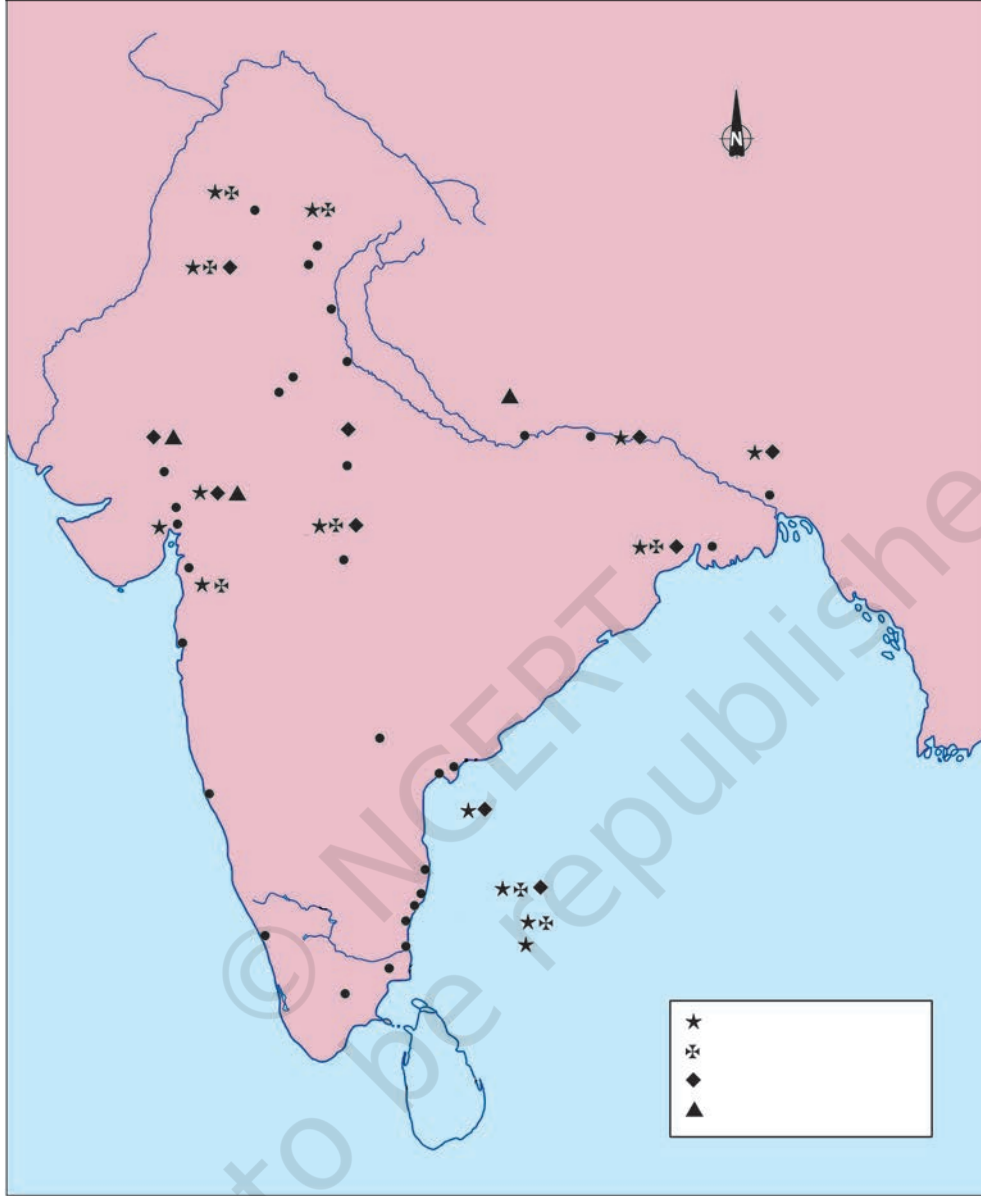
شکل 8 – بنائی کے مراکز: *1500-1750*

اگر آپ نقشے کو دیکھیں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ انیسویں صدی کے آغاز میں کپڑے کی پیداوار چار علاقوں پر مرکوز تھی۔ ان میں بنگال سب سے اہم مرکز تھا۔ بنگال کے پیداواری مراکز جو متعدد دریاؤں کے ڈیلٹا پر واقع تھے اپنا سامان دور دراز علاقوں میں آسانی سے بھیج سکتے تھے۔ یہ بات مت بھولیے کہ انیسویں صدی کے آغاز میں ریلوے کا ارتقا نہیں ہوا تھا اور بڑے پیمانے پر سڑکیں بنانے کا کام شروع ہی ہوا تھا۔

اٹھارھویں صدی میں مشرقی بنگال (موجودہ بنگلہ دیش) میں ڈھاکہ کپڑے کی صنعت کا سب سے پہلا مرکز تھا۔ یہ اپنی ململ اور جام دانی بنائی کے لیے مشہور تھا۔

اگر آپ نقشے میں ہندوستان کے جنوبی حصے پر نظر ڈالیں تو آپ کو مدراس سے شمالی آندھرا پردیش تک پھیلے کورومنڈل کے ساحل کے ساتھ ساتھ سوتی کپڑے کی بنائی کے بہت سے مراکز نظر آئیں گے۔ مغربی ساحل پر آپ کو گجرات میں بھی بنائی کے اہم مراکز دکھائی دیں گے۔

بنکر کون تھے؟

بنکروں کا تعلق اکثر ایسی برادریوں سے ہوتا ہے جنھیں بُننے میں مہارت ہوتی ہے اور ان کی یہ فنی مہارت ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔ بنگال کے تانتی بنکر، شمالی ہندوستان کے جولاہے یا مومن بنکر، جنوبی ہندوستان کے سالے (Sale)، کیکولار (Kaikollar) اور دیوانگ کچھ ایسی ہی برادریاں ہیں جو بُنائی کے لیے شہرت رکھتی تھیں۔

پیداوار کا پہلا مرحلہ کتائی (Spinning) ہوتا تھا۔ یہ کام اکثر عورتیں کرتی تھیں۔ گھر میں کاتنے کے لیے چرخہ اور تکلی بنیادی سامان تھے۔ دھاگہ چرخے پر کاتا جاتا اور تکلی پر لپیٹا جاتا تھا۔ جب کتائی پوری ہو جاتی تو بنکر اس دھاگے سے کپڑا بنتے۔ بنکروں کی زیادہ تر برادریوں میں بنائی کا کام مرد کرتے تھے۔ رنگین کپڑوں کے لیے دھاگے کو رنگ ریز رنگتے، چھپے ہوئے کپڑوں کے لیے بلاک پرنٹرس کے ماہرین کی ضرورت پڑتی تھی جنھیں چھیپی گر کہا جاتا تھا۔ ہتھ کرگھے کی بنائی اور اس سے متعلقہ پیشے سے لاکھوں ہندوستانیوں کی روزی روٹی کا ذریعہ تھے۔

شکل 9– بنگال کا تانتی بنکر، *1790* کی دہائی میں بلجیم کے مصور سالونس (Solvyns) کی بنائی تصویر

اس تصویر میں ایک تانتی بنکر ایک گڈھے میں لگے کرگھے پر کام کر رہا ہے۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ گڈھے والا کرگھا کیا ہوتا ہے؟

ہندوستانی کپڑے کی صنعت کا زوال

برطانیہ میں سوتی صنعت کی ترقی ہوئی تو ہندوستان میں کپڑے کے صنعت کاروں پر کئی طریقوں سے اثر پڑا۔ اوّل یہ کہ ہندوستانی کپڑوں کو اب یوروپ اور امریکا کے بازاروں میں برطانوی کپڑوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ دوسرے انگلینڈ کو کپڑوں کی برآمد مسلسل مشکل ہوتی چلی گئی کیوں کہ برطانیہ میں درآمد کیے جانے والے ہندوستانی کپڑوں پر بھاری ڈیوٹی لگا دی گئی۔

اورنگ – یہ مال گودام کے لیے ایک فارسی اصطلاح ہے۔ ایسی جگہ جہاں فروخت سے پہلے سامان کو اکٹھا کیا جاتا ہے۔ اس لفظ کا استعمال کارخانہ یا ورکشاپ کے لیے کیا جاتا ہے۔

ماخذ 1

''ہم بھوکوں مر جائیں گے''

1823 میں ہندوستان میں کمپنی کی حکومت کو 12,000 بنکروں کی طرف سے ایک عرضداشت ملی جس میں لکھا تھا:

ہمارے اجداد اور ہم کمپنی کی طرف سے پیشگی رقوم حاصل کرتے رہے ہیں اور کمپنی کے لیے نفیس قسم کے کپڑے بن کر ہم اپنا اور اپنے اہل خانہ کا پیٹ پالتے رہے ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے اورنگ (کارخانے) ختم کر دیے گئے ہیں۔ تب سے کوئی ذریعۂ معاش نہ ہونے کی بنا پر ہمارے اہل خانہ کے لیے روزی روٹی حاصل کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ ہم کپڑا بننے والے لوگ ہیں اور کوئی دوسرا کام نہیں جانتے۔ اگر بورڈ آف ٹریڈ (تجارتی بورڈ) نے ہم پر مہربانی نہ کی اور ہمیں کپڑوں کے آرڈر نہ دیے تو ہم بھوکوں مر جائیں گے۔

بورڈ آف ٹریڈ کی کاروائی، *3* فروری *1824*

2019-20

ماخذ 2

’’برائے مہربانی اس کو اپنے اخبار میں چھاپ دیجیے‘‘

ایک سوت کاتنے والی بیوہ عورت نے 1828 میں ایک بنگالی اخبار ’’سماچار درپن‘‘ کو اپنی حالت زار اس طرح لکھ کر بھیجی:

مدیر، سماچار

میں ایک سوت کاتنے والی عورت ہوں۔ بہت زیادہ پریشان ہوکر میں یہ خط لکھ رہی ہوں۔ برائے مہربانی اسے اپنے اخبار میں چھاپ دیجیے...... جب 22 سال کی تھی تو میں بیوہ ہوگئی۔ اس وقت میری تین لڑکیاں تھیں۔ مرتے وقت میرے شوہر نے کچھ بھی نہیں چھوڑا تھا...... میں نے ان کی آخری رسومات ادا کرنے کے لیے اپنے زیورات فروخت کردیے۔ جب ہمیں فاقہ کشی کی نوبت آگئی تو خدا نے ہمارے لیے ایک راہ پیدا کردی جس سے ہم نے اپنی زندگی بچائی۔ میں نے تکلی اور چرخے پر سوت کاتنا شروع کردیا۔

بنکر ہمارے گھر آتے اور چرخے پر کتا ہوا سوتی دھاگہ تین تولہ فی روپیے کے حساب سے خرید کرلے جاتے۔ کہنے پر مجھ کو حسب ضرورت پیشگی رقم بھی بنکروں سے مل جاتی۔ اب ہمارے روٹی اور کپڑے کا مسئلہ حل ہوگیا تھا۔ چند سال میں میں نے 28 روپیہ جمع کیے اور ایک بیٹی کی شادی کردی۔ پھر اسی طرح تینوں بیٹیوں کی بھی شادی کردی۔

اب تین سال ہوگئے ہم دونوں عورتوں یعنی میں اور میری ساس کے پاس کچھ بھی کھانے کو نہیں ہے۔ اب سوت خریدنے کے لیے بنکر ہمارے گھر نہیں آتے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اگر سوت کو بازار میں بھی بھیجا جائے تو پرانی شرح کے حساب سے ایک چوتھائی قیمت پر بھی یہ سوت نہیں بکتا۔

مجھے نہیں معلوم کہ یہ سب کیسے ہوا۔ اس بارے میں میں نے بہت سے لوگوں سے معلوم کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ بلاٹی (ولایتی) دوسوتی دھاگہ بڑے پیمانے پر درآمد کیا جارہا ہے۔ بنکر اس دھاگے کو خریدتے ہیں اور کپڑا بُنتے ہیں جنھیں لوگ دو مہینے سے زیادہ استعمال نہیں کرپاتے۔ یہ کپڑے جلدی پھٹ جاتے ہیں۔

سوت کاتنے والی ایک دکھیاری کی عرضداشت

انیسویں صدی کے شروع ہوتے ہوتے انگلینڈ میں بنے سوتی کپڑوں نے ہندوستانی مال کو افریقہ، امریکا اور یوروپ میں اپنے روایتی بازاروں سے نکال باہر کرنے میں کامیابی حاصل کرلی۔ اب ہندوستان میں ہزاروں بنکر بے روزگار ہوگئے۔ سب سے زیادہ بنگال کے بنکر متاثر ہوئے۔ انگریز اور یوروپی کمپنیوں نے ہندوستانی مال خریدنا بند کردیا۔ اب ان کے ایجنٹ مال کی سپلائی برقرار رکھنے کے لیے بنکروں کو پیشگی رقم بھی نہیں دیتے تھے۔ پریشان ہوکر بنکروں نے مدد کے لیے حکومت کو درخواستیں دیں۔

لیکن ابھی مزید برے حالات آنے والے تھے۔ 1830 کی دہائی تک ہندوستان میں برطانوی سوتی کپڑوں کا سیلاب سا آگیا۔ درحقیقت 1880 کی دہائی تک سوتی کپڑا پہننے والے دو تہائی ہندوستانی برطانیہ میں تیار کیے ہوئے کپڑے پہننے لگے تھے۔ اس صورت حال سے نہ صرف ماہر کاریگروں پر اثر پڑا بلکہ سوت کاتنے والے بھی متاثر ہوئے۔ ہزاروں دیہی عورتیں جو سوتی دھاگہ کات کر پیٹ پالتی تھیں بے روزگار ہوگئیں۔

ہندوستان میں ہتھ کرگھے کی بنائی بالکل ہی ختم نہیں ہوئی اس کی وجہ یہ تھی کہ کچھ اقسام کے کپڑے مشینوں سے تیار نہیں کیے جاسکتے تھے۔ نازک بارڈر والی ساڑیاں یا روایتی طور پر

سرگرمی

ماخذ 1 اور 2 پڑھیے۔ عرضداشت لکھنے والوں نے اپنی فاقہ کشی کے حالات کے لیے کن حالات کی طرف اشارے کیے ہیں۔

2019-20

بُنے جانے والے کپڑے مشینیں کس طرح تیار کرتیں؟ نفیس کام والے اس قسم کے کپڑوں کی مانگ دولت مند طبقے میں ہی نہیں بلکہ متوسط طبقے میں بھی تھی۔ اس کے علاوہ برطانوی صنعت کار ایسا بہت معمولی اور موٹا کپڑا نہیں بنا پاتے تھے جسے غریب ہندوستانی عوام پہن سکتے۔

آپ نے مغربی ہندوستان کے شہر شولاپور اور جنوبی ہند کے شہر مدورا کے بارے میں ضرور سنا ہوگا۔ یہ شہر انیسویں صدی کے اواخر میں بُنائی کے اہم اور نئے مراکز تھے۔ بعد میں قومی تحریک کے زمانے میں مہاتما گاندھی نے لوگوں سے درخواست کی کہ وہ درآمد کیے گئے کپڑے کا بائیکاٹ کریں اور صرف ہاتھ سے کاتے اور بنے گئے کپڑے کا ہی استعمال کریں۔ اب کھادی قومیت یا قوم پسندی کی ایک علامت بن گئی۔ چرخہ ہندوستان کی نمائندگی کرنے لگا اور 1931 میں انڈین نیشنل کانگریس کے ترنگے جھنڈے کے درمیان بھی چرخے کے نشان کو اختیار کر لیا گیا۔

اُن بنائی اور کتائی کرنے والوں پر کیا گزری جن کی روزی روٹی چھن گئی تھی؟ بہت سے کپڑا بننے والے زرعی مزدور بن گئے۔ ان میں سے کچھ تو کام کی تلاش میں شہروں کی طرف ہجرت کر گئے اور کچھ افریقہ اور جنوبی امریکا کے کھیتوں میں کام کرنے کے لیے چلے گئے۔ ہتھ کرگھے پر کام کرنے والوں میں سے کچھ بنکروں کو ان نئی سوتی ملوں میں کام مل گیا جو بمبئی (آج کل ممبئی)، احمد آباد، شولاپور، ناگپور اور کانپور میں قائم ہو گئی تھیں۔

سوتی مل کا قیام

ہندوستان میں پہلی سوتی مل 1854 میں بمبئی میں قائم ہوئی جہاں سوت کی کتائی ہوتی تھی۔ انیسویں صدی کے اوائل سے ہی بمبئی ایک اہم بندرگاہ بن گیا تھا جہاں سے ہندوستان کا خام سوت انگلینڈ اور چین کو بھیجا جاتا تھا۔ یہ بندرگاہ مغربی ہندوستان کے کالی مٹی والے اس خطے سے قریب تھا جہاں کپاس کی پیداوار ہوتی تھی۔ جب سوتی کپڑے کی ملیں قائم ہو گئیں تو انھیں خام مال آسانی سے ملنے لگا۔

1900 تک 84 سے زیادہ ملیں بمبئی میں کام کرنے لگی تھیں۔ ان میں سے بہت سی ملوں کو ان پارسی یا گجراتی تاجروں نے قائم کیا تھا جنھوں نے چین سے تجارت کر کے دولت کمائی تھی۔

2019-20

شکل 10 – ایک سوتی کارخانے میں کاریگروں کا ایک منظر، 1900، راجا دین دیال کے ذریعے کھینچی گئی ایک تصویر

کتائی کے شعبوں میں اکثر عورتیں کام کرتی تھیں جب کہ بنائی کے شعبوں میں کام کرنے والے زیادہ تر مرد ہوتے تھے۔

بہت سی ملیں دوسرے شہروں میں بھی قائم ہوئیں۔ احمد آباد میں پہلی مل 1861 میں شروع ہوئی تھی۔ ایک سال کے بعد ہی ایک مل صوبہ متحدہ (جواب اتر پردیش ہے) کے کانپور شہر میں قائم ہوئی۔ سوتی ملوں کی بڑھتی ہوئی تعداد سے مزدوروں کی مانگ بھی بڑھی۔ ہزاروں غریب کاشتکار، کاریگر اور زرعی مزدوران ملوں میں کام کرنے کے لیے شہروں کی طرف کوچ کر گئے۔

اپنے قیام کی پہلی ہی چند دہائیوں میں ہندوستانی کپڑا صنعت کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ برطانیہ سے درآمد شدہ سستے کپڑوں سے مقابلہ آسان نہ تھا۔ اکثر ملکوں میں حکومتوں نے درآمد پر بھاری ڈیوٹی لگا کر اپنی داخلی صنعت کی حفاظت کی۔ اس کے نتیجے میں ان ملکوں میں مقابلہ آرائی کا خاتمہ ہوا اور نوخیز صنعتوں کو تحفظ مل گیا۔ ہندوستان میں نوآبادی حکومت نے مقامی صنعتوں کو ایسا تحفظ دینے سے انکار کر دیا۔ ہندوستان میں سوتی صنعت کے فروغ میں اس وقت تیزی آئی جب پہلی جنگ عظیم کے دوران برطانیہ سے کپڑے کی درآمد رو بہ زوال ہوگئی اور ہندوستانی فیکٹریوں سے کہا گیا کہ وہ فوجی سپلائی کے لیے کپڑا مہیا کرائیں۔

آہن گری (Smelting) – یہ کسی چٹان (یا مٹی) کو اونچی حرارت پر گرم کر کے اس سے دھات نکالنے کا عمل ہے نیز یہ نئی چیزیں بنانے کے لیے دھات سے بنی چیزوں کو پگھلانے کا عمل بھی ہے

ٹیپو سلطان کی تلوار اور ووٹز فولاد

ٹیپو سلطان نے 1799 تک میسور پر حکمرانی کی اور انگریزوں سے چار جنگیں لڑیں اور حالت جنگ میں ہی تلوار ہاتھ میں لیے اس دنیا سے رخصت بھی ہوا۔ ہم اسی کی ایک مشہور کہانی کو بیان کر کے فولاد اور کچے لوہے کی کہانی کو شروع کریں گے۔ ٹیپو کی مشہورِ زمانہ تلوار انگلینڈ کے عجائب گھر کا بیش قیمت اثاثہ ہے۔ لیکن کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس تلوار میں کیا خاص بات تھی؟ اس تلوار کی دھار نا قابل یقین حد تک سخت اور تیز تھی اور دشمن کے زرہ بکتر کو آسانی سے کاٹ سکتی تھی۔ اس کی تلوار میں یہ خاصیت اس لیے پیدا ہوئی تھی کہ وہ ایک اونچے کاربن والے فولاد سے بنی تھی جسے ووٹز (wootz) کہا جاتا ہے۔ یہ ووٹز فولاد تمام جنوبی ہندوستان میں پیدا ہوتا تھا۔ اس سے بنی ہوئی تلواروں کی دھار بہت تیز ہوتی تھی اور اس کی آب خوب چمکتی تھی۔ اس کی ساخت میں چھوٹے چھوٹے کاربن کے قلم (Crystals) لوہے میں گندھے ہوتے تھے۔

فرانسس بکانن نے ٹیپو سلطان کی وفات کے ایک سال بعد 1800 میں میسور کا سفر کیا۔ اس نے اس تکنیک کی تفصیل لکھی جس کے ذریعے میسور کے اندر ہزاروں لوہا پگھلانے والی بھٹّیوں میں ووٹز فولاد تیار ہوتا تھا۔ ان بھٹّیوں میں لوہے کے ساتھ کوئلہ ملایا جاتا تھا اور اس کو چھوٹے چھوٹے مٹی کے برتنوں میں رکھا جاتا تھا۔ درجۂ حرارت کو ایک پیچیدہ عمل کے ذریعے کنٹرول کر کے آہن گر اسٹیل کے ڈھلے ہوئے ڈلے بناتے تھے جو نہ صرف ہندوستان میں بلکہ مغربی اور مرکزی ایشیا میں بھی تلوار بنانے کے کام آتے تھے۔

ووٹز (wootz) کنڑ لفظ اُکّو، تلگو لفظ ہُکّو اور تمل و ملیالم لفظ اُرُکّو کا انگریزی متبادل ہے۔ یہ سب الفاظ فولاد کا مفہوم ادا کرتے ہیں۔

ہندوستان کے ووٹز فولاد نے یوروپی سائنسدانوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ شہرت یافتہ سائنس داں اور بجلی اور الیکٹرو میگنیٹزم (Electromagnetism) کے موجد مائکل فراڈے (Michael Faraday) نے ہندوستانی ووٹز کے خواص کے مطالعے میں چار سال (1822-1818) لگائے۔ بہر حال، ووٹز فولاد بنانے کا طریقہ جو جنوبی ہند میں بڑے پیمانے پر مشہور تھا انیسویں صدی کے وسط تک مکمل طور پر ختم ہو گیا۔ کیا آپ اندازہ

شکل 11 – اٹھارھویں صدی کے آخر میں ٹیپو کی تلوار
ٹیپو کی تلوار کے فولاد سے بنے قبضے پر قرآنی آیات سونے سے لکھی ہوئی ہیں جن میں جنگ میں فتح حاصل کرنے کا پیغام ہے۔ قبضے کے نچلی طرف بنے ہوئے شیر کے سر پر غور کیجیے۔

سرگرمی

نوابوں اور راجاؤں کی شکست سے لوہا اور فولاد کی صنعت کیوں متاثر ہوئی؟

کرسکتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوا؟ جب انگریزوں نے ہندوستان فتح کرلیا تو تلواراورزرہ بکتر بنانے کی صنعت بھی ختم ہوگئی اور انگلینڈ سے درآمد شدہ لوہے اور فولاد نے ہندوستانی دستکاروں کے ذریعے تیار کیے گئے لوہےاورفولاد کی جگہ لے لی۔

گاؤں کی ویران بھٹیاں

ووٹزفولاد کی تیاری میں لوہے کوصاف کرنے کی تکنیک بہت مخصوص ہوتی ہے لیکن ہندوستان میں لوہے کو پگھلانے کا عمل انیسویں صدی کے خاتمہ تک بہت عام تھا۔خاص طور پر بہاراور وسطی ہندوستان کے ہر ضلع میں آہن گر ہوتے تھے جو کچھ دھات کے مقامی ذخیروں کا استعمال کر کے لوہا بناتے تھے جس سے عام استعمال کے اوزار بنائے جاتے تھے۔ یہ بھٹیاں اکثر مٹی اور دھوپ میں سکھائی گئی اینٹوں کی بنی ہوتی تھیں۔ آہن گری کا کام مرد کرتے تھے جب کہ دھونکنیوں (Bellows) پرعورتیں کام کرتی تھیں۔ان دھونکنیوں سے ہوا پمپ کی جاتی تھی جس سے کوئلہ جلتا رہتا تھا۔

دھونکنی – ایک ایسا آلہ جس سے ہوا پمپ کی جاتی ہے۔

بہرحال انیسویں صدی کے آخر تک آہن گری کا ہنر زوال پذیر ہوگیا۔ اکثر گاؤں میں بھٹیوں کا کوئی استعمال نہ رہا اور تیار لوہے کی مقدار بھی کم ہوگئی۔ایسا کیوں ہوا؟

شکل 12 – پلامو (جھارکھنڈ) کے آہن گر

2019-20

شکل 13– وسطی ہندوستان کے ایک گاؤں کا منظر جہاں اگریہ فرقے کے لوگ رہتے تھے جو آہنگری کا کام کرتے تھے

اگریہ جیسے کچھ فرقے آہنگری کے کام میں ماہر تھے۔انیسویں صدی کے آخر میں ہندوستان کے خشک خطوں میں کئی بار قحط پڑا۔وسطی ہندوستان میں بہت سے لوہا پگھلانے کا کام کرنے والے اگریہ فرقے نے اپنا کام بند کردیا اور اپنے گاؤوں سے ہجرت کرگئے تاکہ سخت حالات میں اپنی گذر بسر کے لیے کسی دوسرے کام کی تلاش کرسکیں۔ان میں سے بڑی تعداد نے پھر کبھی بھٹیوں کا کام نہیں کیا۔

اس کی ایک وجہ تو وہ نئے جنگلاتی قوانین تھے جو آپ باب 4 میں پڑھ چکے ہیں۔ جب نوآبادی حکومت نے لوگوں کو محفوظ جنگلات میں جانے سے روک دیا تو لوہا پگھلانے والوں کو کوئلے کے لیے لکڑی کہاں سے ملتی؟ وہ خام لوہا کہاں سے حاصل کرتے؟ لوگ قانون کو کبھی کبھی توڑ کر چوری چھپے جنگلوں میں داخل ہوکر لکڑیاں جمع کرلیتے لیکن اس بنیاد پر وہ پائیدار طور پر اپنا پیشہ جاری نہیں رکھ سکتے تھے۔ بہت سے لوگوں نے اپنا یہ فن ترک کردیا اور اپنی روزی روٹی کے لیے دوسرے دھندوں کی تلاش کرنے لگے۔

کچھ علاقوں میں حکومت نے انھیں کو جنگلات میں جانے کی منظوری بھی دے دی تھی لیکن اس کے لیے محکمۂ جنگلات کو فی بھٹی بہت زیادہ محصول ادا کرنا پڑتا تھا جس سے ان کی آمدنی کم ہوجاتی تھی۔

اس کے علاوہ انیسویں صدی کے آخر تک برطانیہ سے لوہا اور فولاد درآمد ہونے لگی تھی۔ ہندوستانی لوہار اوزار، ہتھیار اور برتن بنانے کے لیے درآمد شدہ لوہا استعمال کرنے لگے تھے۔اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ مقامی آہنگروں کے تیار کردہ لوہے کی مانگ کم ہوگئی۔

بیسویں صدی کے اوائل میں لوہا اور فولاد تیار کرنے والے کاریگروں کو نئے مقابلے کا سامنا کرنا پڑا۔

ماخذ 3

ایک عام صنعت

جیولوجیکل سروے آف انڈیا کی رپورٹ کے مطابق:

ایک زمانے میں آہنگری ہندوستان کی ایک عام صنعت تھی اور گنگا، سندھ اور برہمپتر کے سیلابی خطوں سے دور مشکل سے ہی کوئی ایسا ضلع ہوگا جہاں دھاتی مَیل کے ڈھیر نہ پائے جاتے ہوں۔ایک آہنگر کو ذخائر سے خام لوہے کے حصول میں کوئی دقت پیش نہیں آتی تھی جسے یوروپی مالکان نے سنجیدگی سے نہیں لیا۔

دھاتی مَیل کے ڈھیر (Slag Heaps)

جب دھات کو پگھلایا جاتا ہے تو دھات کا میل یا کچرا باقی رہ جاتا ہے

ہندوستان میں لوہا اور فولاد کے کارخانوں کا آغاز

1904 کی بات ہے۔ اپریل کے گرم مہینے میں ایک امریکی ماہر ارضیات چارلز ویلڈ (Charles Weld) اور جمشید جی ٹاٹا کے بڑے بیٹے دوراب جی ٹاٹا کچ دھات کے ذخیروں کی تلاش میں چھتیس گڑھ کے علاقوں کا سفر کر رہے تھے۔ وہ ہندوستان میں لوہا اور فولاد کا ایک جدید کارخانہ قائم کرنا چاہتے تھے اور اس کے لیے اچھے خام لوہے کے ذخائر کی تلاش میں مہینوں سے ایک مہنگے سفر پر نکلے ہوئے تھے۔ جمشید جی ٹاٹا نے ہندوستان میں لوہا اور اسٹیل کی ایک بڑی صنعت قائم کرنے کے لیے اپنی دولت کا ایک بڑا حصہ لگانے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن یہ کام اچھی قسم کی کچ دھات کے ذخائر کی نشاندہی کے بغیر نا قابل عمل تھا۔

ایک دن جنگلوں میں گھنٹوں سفر کرنے کے بعد ویلڈ اور دوراب جی ایک چھوٹے سے گاؤں میں پہنچے۔ وہاں انھوں نے دیکھا کہ کچھ عورتیں اور مرد کچ دھات سے بھری بالٹیاں لے جا رہے تھے۔ یہ 'اگریہ' فرقے کے لوگ تھے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ انھیں یہ کچ دھات کہاں ملی تو انھوں نے دور ایک پہاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ گھنے جنگل میں تھکا دینے والے سفر کے بعد ویلڈ اور دوراب جی اس پہاڑی کے پاس پہنچے اور تفتیش کے بعد ماہر ارضیات ویلڈ نے کہا کہ جس چیز کی انھیں تلاش تھی وہ مل گئی۔ راج ہارا کی پہاڑیوں میں دنیا کی بہترین قسم کی کچ دھات پائی جاتی ہے۔

لیکن ایک مشکل اور بھی تھی، یہ علاقہ سوکھا تھا اور یہاں فیکٹری چلانے کے لیے ضرورت کے لائق پانی کہیں موجود نہ تھا۔ فیکٹری قائم کرنے کے لیے ٹاٹا خاندان نے مناسب جگہ کی تلاش جاری رکھی۔ بہرحال 'اگریہ' فرقے کے لوگوں نے کچ دھات کے ذخیرے کی نشاندہی میں ان کی مدد کی اور بعد کے زمانے میں بھلائی اسٹیل پلانٹ کے لیے خام مال کی فراہمی اسی سے ہوئی۔

شکل 14 – دریائے سبرنا ریکھا کے ساحل پر ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل فیکٹری، *1940*

چند سالوں کے بعد دریائے سُبرناریکھا کے کنارے فیکٹری اور ایک صنعتی شہر– جمشید پور– قائم کرنے کے لیے جنگل کے ایک بڑے حصے کو صاف کر دیا گیا۔ یہاں کچ دھات کے ذخائر کے قریب پانی بھی موجود تھا۔ ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی (TISCO) نے 1912 میں اسٹیل کی پیداوار شروع کر دی۔

یہ کمپنی ایک بڑے مبارک موقع پر شروع ہوئی تھی۔ انیسویں صدی کے آخر میں ہندوستان میں اسٹیل برطانیہ سے درآمد کیا جاتا تھا۔ ہندوستان میں ریلوے کی توسیع کے نتیجے میں برطانیہ میں تیار شدہ ریلوں کو ایک بہت بڑی منڈی مل گئی تھی۔ بہت عرصے تک تو ہندوستانی ریلوے کے برطانوی ماہرین یہ یقین کرنے پر ہی آمادہ نہ تھے کہ اچھی قسم کا فولاد ہندوستان میں بھی تیار کیا جا سکتا ہے۔

جب ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی قائم ہو گئی تو صورت حال بدلنے لگی۔ 1914 میں پہلی جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ اب برطانیہ میں تیار شدہ اسٹیل یوروپ کی جنگی ضروریات

شکل 15 – جنگ کے خاتمہ پر توسیع
جنگ کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے، ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی کو اپنی پیداواری صلاحیت بڑھانی پڑی اور فیکٹری کو بھی بڑا کرنا پڑا۔ توسیع کا پروگرام جنگ کے بعد بھی جاری رہا۔ یہاں آپ 1919 میں جمشید پور کے اندر نئے بجلی گھروں اور بوائلروں کو تعمیر ہوتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں۔

2019-20

پوری کرنے لگا۔ اس طرح غیر متوقع طور پر ہندوستان میں برطانوی درآمد گھٹ گئی اور ہندوستانی ریلوے ریلوں کی سپلائی کے لیے ٹسکو (TISCO) کی طرف متوجہ ہوئی۔ چوں کہ یہ جنگ کئی برسوں تک چلتی رہی اس لیے ٹسکو کو جنگ کے لیے بھی گولے اور گاڑیوں کے پہیے تیار کرنے پڑے۔ 1919 کے آتے آتے نوآبادی حکومت ٹسکو کی تیار کردہ نوّے فی صد اسٹیل خریدنے لگی تھی۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ٹسکو حکومت برطانیہ کے اندر اسٹیل کی سب سے بڑی کمپنی بن گئی۔

سوتی کپڑے کی طرح لوہا اور اسٹیل کے معاملے میں صنعتی توسیع اس وقت ہوئی جب ہندوستان میں برطانوی درآمد میں کمی آئی اور ہندوستان کے صنعتی مال کی مانگ بازار میں بڑھ گئی۔ ایسا پہلی جنگ عظیم کے دوران اور اس کے بعد ہوا۔ چوں کہ قومی تحریک کو فروغ ہوا اور صنعتی طبقہ زیادہ مضبوط ہو گیا اس لیے سرکاری تحفظ کی مانگ بھی بڑھ گئی۔ ہندوستان پر اپنا تسلط برقرار رکھنے کی جدوجہد میں برطانوی حکمرانوں کو نوآبادی حکومت کی آخری دہائیوں میں ان میں سے بہت سی مانگیں پوری کرنی پڑیں۔

کہیں اور

جاپان میں صنعت کاری کے ابتدائی سال

انیسویں صدی کے آخر میں جاپان کی صنعت کاری (Industrialisation) کی تاریخ، ہندوستان کی صنعت کاری سے مختلف ہے۔ ہندوستان کی نوآبادی حکومت برطانوی سامان کے لیے منڈی کی توسیع چاہتی تھی لیکن ہندوستانی صنعت کاروں کی مدد کرنا نہیں چاہتی تھی جب کہ جاپان کی حکومت وہاں کے صنعت کاروں کی حوصلہ افزائی کر رہی تھی۔

جاپان میں میجی (Meiji) حکومت جو 1868 میں برسرِ اقتدار تھی اس بات پر یقین رکھتی تھی کہ جاپان میں صنعت کاری کی ضرورت ہے تاکہ وہ مغربی غلبے کا مقابلہ کر سکے۔ چنانچہ جاپان نے صنعت کاری (Industrialisation) کے سلسلے میں مختلف اقدامات کیے اس نے ڈاک اور تار، ریلوے اور بھاپ کی قوت سے چلنے والی جہاز رانی کو ترقی دی۔ جاپان کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے مغرب کی انتہائی ترقی یافتہ ٹیکنالوجی کو درآمد کیا اور اس کو ملکی ضروریات سے ہم آہنگ بھی کیا۔ جاپانی پیشہ وروں (Professionals) کو تربیت دینے کے لیے بیرونی ماہرین کی خدمات حاصل کیں۔ حکومت کے ذریعے قائم شدہ بینکوں نے سرمایہ کاری کے لیے صنعت کاروں کو دل کھول کر قرض دیے۔ بڑی صنعتوں کو پہلے حکومت نے قائم کیا اور پھر ان کو صنعتی گھرانوں کے ہاتھ سستی شرحوں پر فروخت کر دیا۔

ہندوستان میں نوآبادیاتی غلبے نے ملک کی صنعت کاری کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کیں۔ جاپان میں غیر ملکی قبضے کے خوف نے صنعت کاری کے لیے مہمیز کا کام کیا لیکن اس کا یہ مطلب بھی تھا کہ جاپان کی صنعتی ترقی شروع سے ہی فوجی ضروریات سے مربوط تھی۔

دوہرائیے

1۔ یوروپ میں کس قسم کے کپڑے کا بازار زیادہ بڑا تھا؟

2۔ جامدانی سے کیا مراد ہے؟

3۔ بندنا کسے کہتے ہیں؟

4۔ 'اگریہ' کون تھے؟

5۔ خالی جگہوں کو پر کیجیے:

(a) لفظ چنٹز ____________ لفظ سے بنا ہے۔

(b) ٹیپو سلطان کی تلوار ____________ فولاد سے بنی ہوئی تھی۔

(c) ہندوستانی کپڑے کی برآمد کو ____________ صدی میں زوال ہوا۔

گفتگو کیجیے

6۔ مختلف کپڑوں کے ناموں سے ان کی تاریخ کے بارے میں کیا پتہ چلتا ہے؟

7۔ ابتدائی انیسویں صدی میں انگلینڈ کے اون اور ریشم پیدا کرنے والوں نے ہندوستانی کپڑے کی درآمد کی مخالفت کیوں کی؟

8۔ برطانیہ میں سوتی صنعتوں کی ترقی نے ہندوستان میں کپڑا بنکروں کو کس طرح متاثر کیا؟

9۔ ہندوستان کی لوہا پگھلانے کی صنعت انیسویں صدی میں کیوں زوال پذیر ہوگئی؟

10۔ ہندوستانی کپڑے کی صنعت کو اپنی ترقی کے ابتدائی برسوں میں کن مشکلات کا سامنا تھا؟

11۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی کی پیداوار بڑھانے میں کن عوامل نے مدد کی؟

تصور کیجیے

تصور کیجیے کہ آپ انیسویں صدی کے آخر کے ایک کپڑا بنکر ہیں۔ ہندوستانی کارخانوں میں بنے ہوئے کپڑوں کی بازار میں بھرمار ہے۔ اس صورت حال کا آپ کس طرح مقابلہ کریں گے؟

کر کے دیکھیے

12۔ جہاں آپ رہتے ہیں وہاں کی کسی دستکاری کی تاریخ معلوم کیجیے۔اس سلسلے میں آپ دستکاروں کے سماج ،ان کی بدلتی تکنیکوں اور ان کے بازاروں کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ بھی معلوم کیجیے کہ پچھلے پچاس برسوں میں ان میں کیا کیا تبدیلیاں آئی ہیں؟

13۔ ہندوستان کے نقشے پر آج کی مختلف دستکاریوں کے مراکز کی نشاندہی کیجیے۔ پتہ لگایئے کہ یہ مراکز کب وجود میں آئے تھے۔

7 ’دیسی لوگوں‘ کو متمدن کرنا، قوم کو تعلیم یافتہ بنانا

4824CH07

ماہر لسانیات (Linguist) – جو شخص مختلف زبانوں پر عبور رکھتا اور ان کا مطالعہ کرتا ہے۔

پچھلے ابواب میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ برطانوی حکومت نے راجاؤں، نوابوں، کسانوں اور قبائلیوں کی زندگی پر کیا اثر ڈالا۔ اس باب میں ہم یہ سمجھنے کی کوشش کریں گے کہ طلبا کی زندگی پر برطانوی حکومت کے کیا اثرات مرتب ہوئے۔ برطانیہ نہ صرف اپنے مقبوضات کی توسیع اور محصول پر کنٹرول چاہتا تھا بلکہ وہ یہ بھی محسوس کرتے تھے کہ یہ ان کا ایک تہذیبی مشن بھی ہے۔ انھیں ’’دیسی لوگوں کو متمدن بھی بنانا تھا‘‘ اور ان کے رسم و رواج اور ان کی قدروں کو بھی تبدیل کرنا تھا۔

تبدیلیاں کیا لائی جائیں؟ ہندوستانیوں کو کس طرح متمدن اور تعلیم یافتہ بنایا جائے اور ان کو برطانیہ کی نظر میں ’’اچھی رعایا‘‘ کس طرح بنایا جائے؟ ان سوالوں کا انگریزوں کے پاس کوئی سیدھا جواب نہیں تھا۔ ان سوالوں پر کئی دہائیوں تک بحث ہوتی رہی۔

شکل 1 – ولیم جونز فارسی سیکھتے ہوئے

برطانیہ کا تصور تعلیم

آیئے دیکھتے ہیں کہ برطانیہ نے کیا سوچا اور کیا عمل کیا اور یہ بھی غور کرتے ہیں کہ تعلیم کے جن نظریات کو ہم نے تسلیم کرلیا ہے پچھلے دو سو سال کے عرصے میں ان کا ارتقا کیسے ہوا۔ ان سوالوں کے جواب کی تلاش میں ہم یہ بھی دیکھیں گے کہ برطانوی نظریات کے بارے میں ہندوستانیوں کا کیا ردعمل تھا اور ہندوستانیوں کی تعلیم کے بارے میں ان کے اپنے کیا نظریات تھے۔

مشرق شناسی کی روایت

1783 میں ولیم جونز (William Jones) نامی ایک شخص کلکتہ آیا۔ یہ شخص اس سپریم کورٹ کا جونیئر جج مقرر کیا گیا جسے کمپنی نے قائم کیا تھا۔ ایک

ماہر قانون داں ہونے کے علاوہ، جونز ایک ماہر لسانیات بھی تھا۔ اس نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں یونانی اور لاطینی زبانیں پڑھی تھیں۔ وہ فرانسیسی اور انگریزی بھی جانتا تھا۔ اس نے ایک دوست سے عربی بھی سیکھ لی تھی۔ فارسی زبان سے بھی واقفیت تھی۔ کلکتہ میں وہ ہر روز بہت سا وقت پنڈتوں کے ساتھ گزارتا اور ان سے سنسکرت زبان، اس کے قواعد اور شعر کی باریکیاں سمجھا کرتا تھا۔ جلد ہی اس نے قانون، فلسفہ، مذہب، سیاست، اخلاقیات، ریاضی، میڈیسن اور دیگر علوم پر قدیم ہندوستانی متون کا مطالعہ شروع کر دیا۔

جونز کو معلوم ہوا کہ اس زمانے میں اس کے علاوہ کلکتہ میں مقیم بہت سے برطانوی عہدے دار بھی ان علوم میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ ہنری ٹامس کولبروک (Henry Thomas Colebrooke) اور نتھانیل ہالہیڈ (Nathaniel Halhed) جیسے انگریز بھی قدیم ہندوستانی ورثے کی بازیافت، ہندوستانی زبانوں میں مہارت حاصل کرنے اور انگریزی زبان میں فارسی اور سنسکرت کی کتابوں کا ترجمہ کرنے میں مصروف تھے۔ ان سب کے ساتھ مل کر جونز نے ''ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال'' قائم کی اور '' ایشیاٹک ریسرچز '' نامی ایک جرنل بھی نکالا۔

شکل 2 – ہنری ٹامس کولبروک
یہ سنسکرت اور ہندوستان کی قدیم مذہبی تحریروں کا عالم تھا۔

جونز اور کولبروک ہندوستان کے بارے میں ایک مخصوص ذہن کے نمائندے بن گئے۔ یہ دونوں قدیم ثقافتوں کا بڑا احترام کرتے تھے خواہ وہ ہندوستانی ہو یا مغربی۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستانی تہذیب عہد قدیم میں اپنی شان اور عظمت حاصل کر چکی تھی بعد میں بتدریج زوال پذیر ہوتی گئی۔ ہندوستان کو سمجھنے کے لیے ان مذہبی اور قانونی متون کی بازیافت ضروری ہے جو قدیم زمانے میں وجود میں آئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صرف یہی متون ہندوؤں اور مسلمانوں کے قوانین اور حقیقی افکار و خیالات جاننے کا ذریعہ ہیں اور انھیں متون کا جدید مطالعہ ہندوستان کے مستقل کی ترقی کی بنیاد بن سکتا ہے۔

چنانچہ جونز اور کولبروک قدیم متون کی بازیافت، ان کی تفہیم اور ترجمے میں مصروف ہو گئے اور اپنی تحقیق و جستجو دوسروں تک پہنچانے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ اس سے نہ صرف برطانوی لوگ ہندوستانی تہذیب سیکھ سکیں گے بلکہ خود ہندوستانیوں کو بھی اپنے ورثے کی بازیافت میں مدد ملے گی اور وہ اپنے ماضی کی گمشدہ عظمت کو پہچان سکیں گے۔ اس عمل میں انگریز ہندوستانی تہذیب کے سرپرست بھی ہو جائیں گے اور اس کے آقا بھی۔

مدرسہ – ایک عربی لفظ ہے یعنی وہ جگہ جہاں پڑھائی ہوتی ہو یا کسی بھی قسم کا اسکول یا کالج ہو۔

شکل 3 – وارن ہیسٹنگز کی یادگار، رچرڈ ویسٹ ماکوٹ، 1830،
اب وکٹوریہ میموریل (کلکتہ) میں موجود ہے
یہ تصویر بتاتی ہے کہ **مستشرقین** ہندوستان میں برطانوی اقتدار کے بارے میں کس طرح سوچتے تھے۔ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ ہیسٹنگز کی شاہی شبیہ کے ایک طرف کھڑے ہوئے پنڈت کی شبیہ ہے اور دوسری طرف ایک بیٹھے ہوئے **منشی** کی۔ ہیسٹنگز مستشرقین کا پرجوش حامی تھا۔ اسے اور دیگر مستشرقین کو 'ورنا کولر' زبانیں پڑھنے کے لیے ہندوستانی عالموں کی ضرورت تھی جو ان کے مقامی آداب وقوانین بتا سکتے اور ان کے لیے قدیم متون کا ترجمہ وتشریح کر سکتے۔ ہیسٹنگز نے کلکتہ کا مدرسہ قائم کر کے اس سلسلے میں پہل کی۔ اس کا یقین تھا کہ ملک کی قدیم تہذیب وثقافت اور مشرقی علوم کو ہندوستان میں برطانوی راج کی بنیاد بننا چاہیے۔

انھیں خیالات سے متاثر ہو کر کمپنی کے بہت سے عہدیدار اس بات کے حق میں تھے کہ یہاں مغربی تعلیم کے بجائے ہندوستانی تعلیم کو فروغ دیا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ ایسے ادارے قائم کیے جائیں جن میں قدیم ہندوستانی علوم کے مطالعے کی حوصلہ افزائی ہو اور جہاں سنسکرت اور فارسی ادبیات اور شاعری کی تعلیم دی جائے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو وہی علوم سکھائے جائیں جن سے وہ پہلے ہی مانوس ہیں اور جن کی قدر بھی کرتے ہیں۔ انھیں وہ علوم نہ پڑھائے جائیں جو ان کے لیے اجنبی ہوں۔ ان کو یقین تھا کہ اس عمل سے برطانیہ ''دیسی لوگوں'' کے دلوں میں جگہ بنا سکے گا اور اس کی رعایا بدیسی حاکموں کی عزت کرے گی۔

اسی نظریے کے تحت 1781 میں کلکتہ میں عربی، فارسی اور اسلامی قوانین کے لیے ایک مدرسہ قائم کیا گیا۔ اسی طرح 1791 میں بنارس میں ان قدیم سنسکرت متون کے مطالعے کے لیے ایک ہندو کالج قائم کیا گیا تاکہ وہ ملک کے انتظامی امور میں مفید ہو۔

کمپنی کے سارے عہدیدار ایسے خیالات سے اتفاق نہ رکھتے تھے۔ ان میں اکثر مستشرقین کے شدید نکتہ چیں بھی تھے۔

مستشرقین (Orientalists) - ایشیائی زبانوں اور ثقافتوں کے عالم اور محقق۔

منشی – جو شخص فارسی لکھ پڑھ سکے اور پڑھا سکے۔

ورنا کولر – یہ لفظ عام طور پر کسی مقامی بولی یا زبان کے لیے استعمال ہوتا ہے جو معیاری زبان سے مختلف ہو۔ ہندوستان جیسے نوآبادیاتی ملک میں انگریزوں نے اس اصطلاح کا استعمال انگریزی اور مقامی زبانوں میں فرق کرنے کے لیے کیا، کیوں کہ انگریزی شاہی آقاؤں کی زبان تھی۔

''مشرق کی سنگین غلطیاں''

انیسویں صدی کے اوائل ہی سے مختلف برطانوی عہدیداروں نے مستشرقین کے نظریے پر نکتہ چینی شروع کر دی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ مشرقی علوم خامیوں سے پُر اور غیر سائنسی

2019-20

خیالات پر مبنی ہیں۔ ان کے خیال میں مشرقی ادب غیر سنجیدہ اور ہلکا پھلکا ہے۔ اس لیے برطانیہ کے لیے کسی طرح یہ مناسب نہیں تھا کہ وہ عربی اور سنسکرت زبان و ادب کو پڑھانے کی حوصلہ افزائی کریں۔

جیمز مل (James Mill) بھی انھیں لوگوں میں سے تھا جس نے مستشرقین پر شدید تنقید کی۔ اس نے واشگاف انداز میں کہا کہ برطانیہ یہ غلطی نہ کرے کہ دیسی لوگوں کو خوش کرنے کے لیے یا ''ان کا دل جیتنے کے لیے'' انھیں وہ علوم سکھائے جنھیں وہ پسند کرتے ہیں یا جن کو وہ محترم سمجھتے ہیں۔ تعلیم کا مقصد ہی یہ ہے کہ مفید اور قابلِ عمل علوم پڑھائے جائیں۔ اس طرح ہندوستانیوں کو مغربی سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی سے واقف کرایا جائے اور مشرق کی شاعری اور مقدس صحیفوں سے کنارہ کشی اختیار کی جائے۔

1830 کی دہائی آتے آتے مستشرقین پر حملے تیز ہو گئے۔ ٹامس بابینگٹن میکالے (Thomas Babington Macaulay) ان ناقدین میں سب سے زیادہ منھ زور اور بااثر تھا۔ وہ ہندوستان کو ایک غیر مہذب ملک سمجھتا تھا جسے مہذب بنانے کی ضرورت تھی۔ اس کے خیال میں مشرق کے کسی بھی علم کا موازنہ ان علوم سے نہیں کیا جا سکتا جو انگلینڈ کی پیداوار ہیں۔ اس نے لکھا کہ اس بات سے کون انکار کرے گا کہ ''یورپ کی کسی اچھی لائبریری کا ایک ہی شیلف ہندوستان اور عرب کے تمام دیسی ادب سے زیادہ قیمتی ہے۔'' اس نے زور دے کر کہا کہ برطانوی حکومت کو چاہیے کہ وہ ہندوستان میں مشرقی علوم کے فروغ پر سرکاری پیسہ کو برباد نہ کرے، اس لیے کہ اس ذخیرے کا کوئی عملی فائدہ نہیں ہے۔

میکالے نے بڑی شدت اور جوش و خروش سے انگریزی زبان پڑھائے جانے کی ضرورت پر زور دیا۔ اس کے خیال میں انگریزی زبان سے واقف ہو کر ہی ہندوستانی لوگ دنیا کے کچھ اعلیٰ ادبی نمونوں سے واقف ہو سکیں گے۔ انگریزی زبان کے ذریعے ہی وہ مغربی سائنس اور مغربی فلسفے کی ارتقا سے روشناس ہو سکیں گے۔

شکل 4 – ٹامس بابینگٹن میکالے اپنے مطالعہ گاہ میں

میکالے کی اس تجویز کے بعد انگلش ایجوکیشن ایکٹ 1835 نافذ کیا گیا۔ اس کا مقصد اعلیٰ تعلیم کے لیے انگریزی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانا اور کلکتہ مدرسہ اور بنارس سنسکرت کالج جیسے مشرقی اداروں کے فروغ کو روک دینا تھا۔ ان اداروں کو ''زوال آمادہ تاریکی کے مندر'' کہا گیا۔ اس کے تحت اسکولوں کے لیے انگریزی کی درسی کتابیں تیار کی گئیں۔

تعلیم برائے تجارت

1854 میں لندن کی ایسٹ انڈیا کمپنی کے کورٹ آف ڈائرکٹرس نے ہندوستان کے گورنر جنرل کو ایک تعلیمی مراسلہ بھیجا۔ یہ مراسلہ جسے کمپنی کے بورڈ آف کنٹرول کے صدر چارلس ووڈ (Charles Wood) نے جاری کیا تھا۔ تاریخ میں یہ مراسلہ ووڈ مراسلہ (Wood's Despatch) کے نام سے مشہور ہے۔ اس مراسلے میں ہندوستان میں اپنائی جانے والی تعلیمی پالیسی کا خاکہ پیش کیا گیا تھا اور ایک بار پھر مشرقی تعلیم کے مقابلے یورپی نظام تعلیم کے عملی فائدوں پر زور دیا گیا تھا۔

مراسلے میں تعلیم کے جن عملی فائدوں کی طرف اشارے کیے گئے تھے ان میں ایک فائدہ اقتصادی بھی تھا۔ اس مراسلے میں کہا گیا تھا کہ یوروپی تعلیم سے ہندوستانی ان فائدوں کو سمجھ سکیں گے جو کاروبار اور تجارت کی توسیع کے نتیجے میں حاصل ہوتے ہیں اور جن کی مدد سے ملکی وسائل کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ ہندوستانی اگر یورپ کی زندگی کے طور طریقوں سے واقف ہو جائیں گے تو ان کے مذاق اور ان کی خواہشات اور آرزوؤں میں بھی تبدیلی آجائے گی۔ اس سے ہندوستان میں برطانوی مال کی مانگ بھی پیدا ہوگی۔ وہ یوروپ کی بنی چیزیں خریدیں گے بھی اور ان کی تعریف وتحسین بھی کریں گے۔

ووڈ مراسلے میں یہ خیال بھی ظاہر کیا گیا تھا کہ یوروپین تعلیم سے ہندوستانیوں کا اخلاقی کردار بھی بہتر ہوگا۔ اس تعلیم سے ان میں صداقت پسندی اور ایمانداری پیدا ہوگی اور اس طرح یہ تعلیم کمپنی کو ایسے ملازمین مہیا کر سکے گی جو اعتماد اور اعتبار کے قابل ہوں گے۔ مشرقی ادب نہ صرف سنگین خامیوں سے پُر ہے بلکہ اس سے نہ فرائض اور ذمہ داریوں کا احساس پیدا ہوتا ہے اور نہ ضروری انتظامی صلاحیتوں کو فروغ ملتا ہے۔

1854 کے اس مراسلے کے تحت برطانوی حکومت نے کئی اقدام اٹھائے۔ جملہ تعلیمی امور کو قابو میں رکھنے کے لیے تعلیم کے سرکاری محکمے قائم کیے۔ یونیورسٹی ایجوکیشن نظام قائم

ماخذ 1

اہلِ خرد کی زبان؟

انگریزی زبان پڑھانے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے میکالے لکھتا ہے:

سبھی فریق اس ایک نقطے پر متفق ہیں کہ ہندوستانی لوگوں کے درمیان عام طور پر بولیاں بولی جاتی ہیں جن میں نہ ادب ہے اور نہ سائنسی معلومات۔ اس کے علاوہ یہ بولیاں اتنی بے مایہ اور اکھڑ ہیں کہ بغیر کسی بیرونی مدد کے ان میں کسی ڈھنگ کے متن کا ترجمہ بھی نہیں ہوسکتا......

ٹامس بابنگٹن میکالے،
انڈین ایجوکیشن سے متعلق تجویز
2 فروری 1835

ماخذ 2

یوروپی علوم کے حق میں دلیل

1854 کا ووڈ مراسلہ مشرقی علوم کے مخالفین کی فتح کی نشانی تھا۔ اس میں لکھا تھا:

ہمیں یہ بات پرزور انداز میں واضح کر دینی چاہیے کہ ہندوستان میں ہم جس تعلیم کی توسیع چاہتے ہیں اس کا مقصد یوروپ کے ترقی یافتہ فنون، سروسز، فلسفہ اور ادب یا بطور اختصار یوروپین علوم کو فروغ دینا ہے۔

2019-20

کرنے کے لیے بھی اقدامات کیے گئے۔ 1857 میں جب میرٹھ اور دہلی کے سپاہیوں نے بغاوت کی تو کلکتہ، مدراس اور ممبئی میں یونیورسٹیاں قائم کرنے کا عمل جاری تھا۔ اسکولی تعلیمی نظام میں بھی تبدیلیاں لائی جا رہی تھیں۔

سرگرمی

تصور کیجیے کہ آپ 1850 کی دہائی میں رہتے ہیں۔ آپ ووڈ مراسلے کے بارے میں سنتے ہیں۔ آپ اپنے ردِعمل کو تحریر کیجیے۔

شکل 5 – انیسویں صدی میں بمبئی یونیورسٹی کا منظر
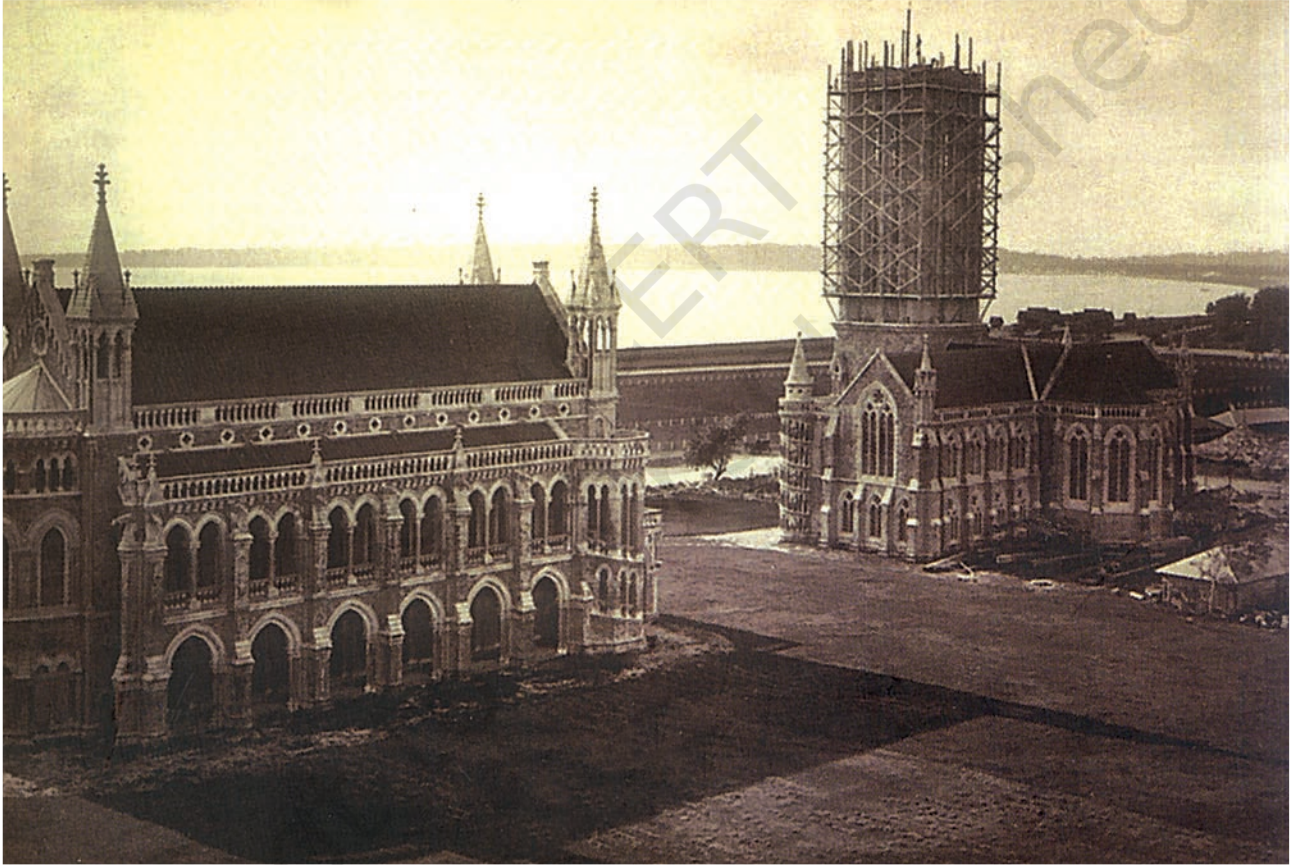
مقامی اسکولوں پر کیا گذری؟

کیا آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ برطانوی عہد حکومت سے قبل بچوں کو کس طرح پڑھایا جاتا تھا؟ آپ کے خیال میں کیا وہ اسکول جاتے تھے؟ اور اگر وہ اسکول جاتے تھے تو برطانوی عہد میں ان اسکولوں پر کیا گذری؟

2019-20

اخلاقی تعلیم کی مانگ

شکل 6 – ولیم کیرے اسکاٹ لینڈ کے ایک عیسائی مبلغ تھے جنھوں نے سرام پور میں مشن کے قیام میں مدد کی تھی

انیسویں صدی میں عیسائی مبلغین نے عملی تعلیم (Practical Education) کے حق میں دلائل پر زبردست تنقید کی، عیسائی مبلغین کا خیال تھا کہ تعلیم کا مقصد لوگوں کے اخلاقی کردار میں سدھار لانا ہے اور اخلاقیات کو صرف عیسائی تعلیمات کے ذریعے ہی بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

1813 تک ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان میں عیسائی مبلغین کی سرگرمیوں کی مخالف رہی۔ اس کا خیال تھا کہ عیسائی مبلغین کی سرگرمیوں سے مقامی لوگ مشتعل ہوں گے اور وہ ہندوستان میں انگریزوں کی موجودگی سے شبہات میں مبتلا ہوں گے۔ برطانیہ کے زیر تصرف علاقوں میں عیسائی مبلغین کوئی ادارہ قائم نہ کر سکے تو انھوں نے ڈنمارک کی ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر تصرف علاقے میں سرام پور میں ایک مشن قائم کر لیا، 1800 میں ایک چھاپہ خانہ اور پھر 1818 میں ایک کالج قائم کر لیا۔

انیسویں صدی کے دوران پورے ہندوستان میں مشنری اسکول قائم ہو گئے۔ 1857 کے بعد برطانوی حکومت مشنری تعلیم کی براہ راست حمایت کرنے سے بچنا چاہتی تھی۔ اس کے پیچھے یہ احساس تھا کہ مقامی رسوم، مقامی طور طریقوں، عقائد اور مذہبی نظریات پر کوئی بھی شدید حملہ کہیں ''دیسی لوگوں'' کے جذبات کو مشتعل نہ کر دے۔

شکل 7 – کلکتے کے قریب دریائے ھگلی پر واقع سرام پور کالج کی تصویر

ولیم ایڈم کی رپورٹ

1830 کی دہائی میں اسکاٹ لینڈ کے ایک عیسائی مبلغ ولیم ایڈم (William Adam) نے بہار اور بنگال کے ضلعوں کا دورہ کیا۔ کمپنی نے ان سے مقامی زبانوں کے اسکولوں (Vernacular Schools) میں تعلیمی حالت کی رپورٹ مانگی۔ ولیم ایڈم نے جو رپورٹ دی وہ بہت دلچسپ ہے۔

شکل 8 – گاؤں کی پاٹھ شالا

یہ ایک ڈچ مصور کی بنائی ہوئی تصویر ہے۔ یہ مصور جس کا نام فرانکوئز سولون تھا اٹھارھویں صدی کے آخر میں ہندوستان آیا تھا۔ اس نے اپنی بنائی ہوئی تصاویر میں لوگوں کی روزمرہ کی زندگی کی عکاسی کی ہے۔

ولیم ایڈم نے پایا کہ بہار اور بنگال میں ایک لاکھ سے زیادہ پاٹھ شالائیں ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے تعلیمی ادارے تھے جن میں بیس سے زیادہ طالب علم نہیں ہوتے تھے۔ لیکن ان پاٹھ شالاؤں میں پڑھنے والوں کی مجموعی تعداد 'قابل لحاظ' یعنی بیس لاکھ سے اوپر تھی۔ یہ ادارے دولت مند لوگوں یا پھر مقامی لوگوں کے قائم کردہ تھے۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ کوئی استاد (گرو) اپنا ادارہ خود قائم کر لیتا تھا۔

تعلیم کا نظام لچیلا تھا۔ آج جن چیزوں کا تصور اسکول سے وابستہ ہے ان میں سے کچھ ہی زمانے کی پاٹھ شالاؤں میں موجود تھیں۔ کوئی مقررہ فیس نہیں تھی، مطبوعہ کتابیں نہیں ہوتی تھیں اور نہ ہی اسکول کے لیے الگ سے کوئی عمارت ہوتی تھی۔ نہ کرسیاں ہوتیں نہ بنچیں، نہ بلیک بورڈ اور نہ ہی کلاسوں کا جداگانہ نظام، نہ حاضری کا رجسٹر ہوتا، نہ سالانہ امتحان ہوتا اور نہ کوئی باقاعدہ نظام الاوقات ہوتا تھا۔ کچھ جگہوں پر کلاسیں کسی برگد کے پیڑ کے نیچے، کہیں گاؤں کی کسی دوکان کے کونے میں یا مندر میں ہو جاتیں یا پھر گرو کے گھر میں ہو جاتیں۔ فیس والدین کی آمدنی پر منحصر ہوتی۔ دولت مند لوگ غریبوں کے مقابلے زیادہ فیس دیتے۔ تعلیم زیادہ تر زبانی ہوتی اور خود گرو یہ فیصلہ کرتا کہ وہ کیا پڑھائے گا۔ وہ یہ فیصلہ طلبا کی ضروریات کو دھیان میں رکھ کر کرتا۔ بچوں کی الگ الگ کلاس میں درجہ بندی نہ کی جاتی۔ سب بچے ایک ہی جگہ بیٹھتے۔ استاد بچوں کی تعلیمی سطح کے لحاظ سے ان کے مختلف گروہوں کو پڑھاتا۔

ایڈم نے پایا کہ یہ لچیلا نظام مقامی ضروریات کے لحاظ سے درست تھا۔ مثال کے طور پر فصل کی کٹائی کے دنوں میں کلاسیں نہیں لگتی تھیں کیوں کہ اس وقت دیہی بچے کھیتوں پر کام

کرنے چلے جاتے تھے۔ جب فصلیں کٹ جاتیں اور اناج کھلیانوں میں اکٹھا ہوجاتا تو پاٹھ شالائیں پھر سے شروع ہوجاتیں۔اس کا مطلب تھا کہ کھیتی باڑی کرنے والے خاندانوں کے بچے بھی پڑھ سکتے تھے۔

نئے معمولات، نئے ضوابط

انیسویں صدی کے وسط تک کمپنی کی دلچسپی بنیادی طور پر اعلیٰ تعلیم سے رہی۔اس لیے اس نے مقامی پاٹھ شالاؤں کو بغیر کسی مداخلت کے ایسے ہی چلنے دیا۔1854 کے بعد کمپنی نے ورنا کولرایجوکیشن (مقامی زبان میں تعلیم) کے نظام میں بہتری لانے کا فیصلہ کیا۔کمپنی نے محسوس کیا کہ نظم وضبط قائم کرکے، کچھ نئے طریقے لاگو کرکے، کچھ نئے ضوابط بناکے اور باقاعدہ معائنے کرکے یہ کام انجام دیا جاسکتا ہے۔

یہ کام کس طرح انجام دیا جائے؟ کمپنی کیا قدم اٹھائے؟ کمپنی نے سرکاری پنڈتوں کا تقرر کیا اور ہر ایک کے ذمے چار سے پانچ تک اسکول دیے گئے۔ان پنڈتوں کا کام پاٹھ شالاؤں میں جاکر معیار تدریس کو بہتر بنانا ہوتا تھا۔ ہر استاد سے وقتاً فوقتاً رپورٹ لی جاتی اور وہ باقاعدہ نظام الاوقات کے مطابق کلاسیں لیتا۔اب تعلیم درسی کتابوں کی بنیاد پر ہوتی اور ہر سال ان کا امتحان لیا جاتا۔طلبا سے ایک مقررہ فیس وصول کی جاتی اور وہ باقاعدہ کلاسوں میں آتے، اپنی جگہوں پر بیٹھتے اور نظم وضبط کی پابندی کرتے۔

جو پاٹھ شالائیں نئے قوانین کو قبول کرتیں ان کو سرکاری مالی امداد ملتی اور جو نئے نظام کے تحت کام کرنا پسند نہ کرتیں انھیں سرکاری امداد نہ دی جاتی۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ایسا ہوا کہ جو استاد اپنی آزادی برقرار رکھنا چاہتے تھے ان کو سرکار سے امداد یافتہ اور سرکار سے منظور شدہ پاٹھ شالاؤں سے مقابلہ کرنا مشکل ہوتا چلا گیا۔

نئے ضوابط اور نئے معمولات کے کچھ اور نتائج بھی مرتب ہوئے۔سابقہ نظام کے تحت غریب کسانوں کے بچے پاٹھ شالاؤں میں تعلیم حاصل کر لیتے تھے کیوں کہ ان کا نظام الاوقات لچکدار ہوتا تھا۔نئے ضابطوں کے مطابق باقاعدہ حاضری ضروری تھی خواہ فصل کی کٹائی کا ہی زمانہ کیوں نہ ہو جس میں غریب بچے کھیتوں میں جا کے کام کرتے تھے۔ اسکول میں غیر حاضری کو ضابطہ شکنی سمجھا جاتا اور اسے تعلیم سے عدم دلچسپی پر محمول کیا جاتا تھا۔

سرگرمی

1۔ تصور کیجیے کہ آپ کی پیدائش 1850 کی دہائی میں ایک غریب خاندان میں ہوئی تھی۔سرکاری پاٹھ شالاؤں کے نئے نظام کے آنے پر آپ کا کیا ردعمل ہوگا؟

2۔ کیا آپ کو علم تھا کہ پرائمری اسکول جانے والے پچاس فی صد بچے 13 یا 14 سال کی عمر تک پہنچ کر اسکول چھوڑ دیتے ہیں۔کیا آپ اس کے امکانی اسباب بتا سکتے ہیں؟

2019-20

قومی تعلیم کا ایجنڈا

یہ صرف برطانوی اعلیٰ افسران ہی نہیں تھے جو ہندوستان کی تعلیم کے بارے میں سوچتے تھے۔ انیسویں صدی کی ابتدا ہی سے ہندوستان کے مختلف حصوں میں مفکرین نے بڑے پیمانے پر تعلیمی توسیع کی ضرورت پر سوچنا اور بات کرنا شروع کر دیا تھا۔ یوروپ کی ترقی سے متاثر ہوکر کچھ ہندوستانیوں نے محسوس کیا کہ مغربی تعلیم ہندوستان کو جدید بنانے میں معاون ہوگی۔ انھوں نے انگریزوں پر زور ڈالا کہ وہ مزید اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں کھولیں اور تعلیم پر مزید پیسہ خرچ کریں۔ ان کوششوں کے بارے میں آپ اگلے باب میں پڑھیں گے۔ لیکن کچھ ایسے ہندوستانی بھی تھے جو بہر حال مغربی تعلیم کے مخالف تھے۔ ان میں مہاتما گاندھی اور رابندر ناتھ ٹیگور جیسی شخصیتیں بھی شامل تھیں۔

آیئے دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ کیا کہتے تھے۔

''انگریزی تعلیم نے ہمیں غلام بنادیا''

مہاتما گاندھی کا یہ کہنا تھا کہ نوآبادیاتی تعلیم نے ہندوستانیوں کے ذہنوں میں احساس کمتری پیدا کر دیا ہے۔ اس تعلیم کے نتیجے میں وہ مغربی تہذیب کو برتر سمجھنے لگے ہیں اور اپنی تہذیب پر فخر کرنے میں عار محسوس کرتے ہیں۔ مہاتما گاندھی کہتے تھے کہ اس تعلیم میں زہر ہے، یہ تعلیم قابلِ مذمت ہے، اس نے ہندوستانیوں کو غلام بنا دیا اور ان کو فریب میں مبتلا کر دیا ہے۔ ان پر مغرب کا ایسا جادو چلا ہے کہ یہ مغرب کی ہر چیز کی تعریف کرنے لگے ہیں اور ان اداروں میں پڑھنے والے طلبا برطانوی راج کے گن گانے لگے ہیں۔ مہاتما گاندھی ایسی تعلیم چاہتے تھے جس سے ہندوستان میں عزتِ نفس اور خود شناسی کا احساس پیدا ہو۔ قومی تحریک کے دوران انھوں نے طلبا سے کہا کہ وہ برطانیہ کو یہ دکھانے کے لیے تعلیمی اداروں کو چھوڑ دیں کہ اب وہ مزید غلام بننے کو تیار نہیں ہیں۔

شکل 9 – مہاتما گاندھی اور کستوربا گاندھی شانتی نکیتن میں رابندرناتھ ٹیگور اور لڑکیوں کے ایک گروپ کے ساتھ بیٹھے ہوئے، 1940
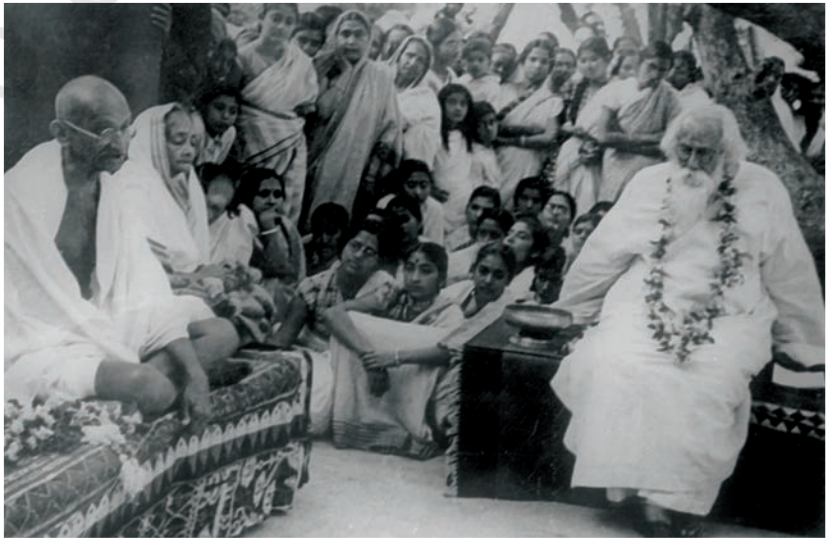
مہاتما گاندھی نے بڑی شدت سے یہ بات محسوس کی کہ ذریعۂ تعلیم ہندوستانی زبانیں ہی ہونی چاہئیں۔ انگریزی تعلیم نے ہندوستانیوں کو مفلوج کر دیا ہے۔ وہ اپنے سماجی ماحول سے کٹ گئے ہیں اور انھیں ''اپنے ہی ملک میں اجنبی'' بنادیا گیا ہے۔ وہ غیر ملکی زبان بولتے ہیں اور اپنی ہی تہذیب کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ انگریزی تعلیم یافتہ اپنے ہی لوگوں سے جڑے رہنے کے طریقے بھول چکے ہیں۔

مہاتما گاندھی نے کہا کہ مغربی تعلیم عملی معلومات اور تجربات کے بجائے یہ تعلیم درسی کتابوں کو زیادہ اہمیت دیتی ہے۔ ان کا قول تھا کہ تعلیم کا مقصد ذہن اور روح کی بالیدگی ہے۔ خواندگی یعنی صرف لکھنا پڑھنا جان لینے کو فی نفسہ تعلیم نہیں کہا جا سکتا۔ لوگوں کو اپنے ہاتھوں سے کام کرنا چاہیے، ہنر سیکھنا چاہیے اور یہ معلوم کرنا چاہیے کہ مختلف چیزیں کس طرح کام کرتی ہیں۔ اس سے ان کے ذہن کا ارتقا ہوگا اور ان کے اندر تفہیم کی صلاحیت پروان چڑھے گی۔

جب قومیت کے جذبات پھیلنے لگے تو دیگر مفکرین نے بھی قومی تعلیم کے نظام کے بارے میں سوچنا شروع کیا کہ یہ انگریزوں کے قائم کردہ طریقے سے نمایاں طور پر مختلف ہونا چاہیے۔

ماخذ 3

''خواندگی فی نفسہ تعلیم نہیں ہے''

مہاتما گاندھی نے لکھا تھا:

تعلیم سے میرا مطلب ہے انسان کے جسم، ذہن اور روح کی ہمہ جہتی ترقی۔ تعلیم سے بچے کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا ہے۔ خواندگی نہ تعلیم کا مقصد ہے اور نہ اس کا آغاز۔ یہ تو صرف ایک ذریعہ ہے جس سے ایک فرد کو تعلیم یافتہ بنایا جا سکتا ہے۔ اسی لیے میں تو کسی بچے کی تعلیم اس کو کوئی سودمند دستکاری سکھا کر اور اس قابل بنا کر کروں گا کہ وہ اپنی تعلیم و تربیت کے ساتھ ہی ساتھ کمانا شروع کر دے...... میں یہ مانتا ہوں کہ تعلیم کے ایسے نظام کے تحت جسم و روح کی بلند ترین ترقی ممکن ہے۔ دستکاری کوئی بھی ہو صرف مشینی طور پر نہ سکھائی جائے جیسا کہ آج کل ہوتا ہے بلکہ اس کو سائنٹفک طور پر سکھایا جائے یعنی بچہ یہ جان لے کہ کوئی عمل کیوں اور کس لیے ہوتا ہے۔

دی کلکٹیڈ ورکس آف مہاتما گاندھی، جلد 72، صفحہ 79

2019-20

ٹیگور کا ’شانتی نکیتن‘

آپ میں سے بہت سے لوگوں نے شانتی نکیتن کے بارے میں سنا ہوگا۔ کیا آپ کو علم ہے کہ شانتی نکیتن کس نے اور کیوں قائم کیا تھا؟

اس ادارے کو 1901 میں رابندر ناتھ ٹیگور نے شروع کیا تھا۔ جب ٹیگور چھوٹے تھے تو انھیں اسکول جانا اچھا نہیں لگتا تھا۔ ان کو لگتا تھا کہ اسکول کا ماحول گھٹا گھٹا اور بڑا سختیوں بھرا ہوتا ہے۔ وہ ان کو بالکل جیل معلوم ہوتا تھا کیوں کہ وہ جو کچھ کرنا چاہتے تھے وہاں کر ہی نہیں پاتے تھے۔ اسی لیے جب بچے استاد کی باتیں سنتے تو ٹیگور کا ذہن کہیں اور بھٹک رہا ہوتا۔ کلکتے میں اسکولی ایام کے تجربے نے تعلیم کے بارے میں ٹیگور کے خیالات کو تشکیل دیا۔ بڑے ہو کر انھوں نے ایک ایسا اسکول قائم کرنا چاہا جہاں بچے خوش رہ سکیں، جہاں وہ خود کو آزاد محسوس کریں، اپنی تخلیقی صلاحیتوں، خیالات اور خواہشات کو سمجھ سکیں۔ ٹیگور نے محسوس کیا کہ بچپن ایسا زمانہ بن جائے جب برطانیہ کے قائم کردہ اسکولی نظام کے سخت اور جابرانہ نظم وضبط سے باہر رہ کر بچے خود کچھ سیکھ سکیں۔ استادوں میں تخیل ہو، وہ بچے کو سمجھ سکیں اور اس کے شوق علم کو بڑھانے میں مدد کر سکیں۔ ٹیگور کے مطابق موجودہ اسکول بچے کی تخلیق کی فطری خواہش اور اس کے احساس تجسس کو دبا دیتے ہیں۔

شکل 10 – 1930 کی دہائی میں شانتی نکیتن میں ایک کلاس چل رہی ہے
یہاں کے ماحول — پیڑوں اور کھلی فضا پر غور کیجیے۔

ٹیگور کا نظریہ تھا کہ تخلیقی آموزش کے لیے ایک فطری ماحول ہونا چاہیے اسی لیے انھوں نے کلکتہ سے 100 کلومیٹر دور ایک دیہی ماحول میں اپنا ایک اسکول قائم کیا۔ وہ اس کو ’’امن کا گہوارہ‘‘ (شانتی نکیتن) سمجھتے تھے جہاں بچے فطرت سے ہم آہنگ ہو کر اپنی خلاّقی کا اظہار کر سکیں۔

تعلیم کے بارے میں گاندھی جی اور ٹیگور کی سوچ یکساں تھی۔ لیکن دونوں کے درمیان کچھ اختلافات بھی تھے۔ گاندھی جی مغربی تہذیب اور اہل مغرب کی مشینوں اور

ٹیکنالوجی پر انحصار کے سخت خلاف تھے۔ ٹیگور جدید مغربی تہذیب کے عناصر اور ہندوستانی تہذیب کی اعلیٰ روایت کو باہم ملانا چاہتے تھے۔ آرٹ، موسیقی اور رقص کے ساتھ ساتھ ٹیگور شانتی نکیتن میں سائنس اور ٹیکنالوجی پڑھانے کی ضرورت پر بھی زور دیتے تھے۔

اسی طرح بہت سے افراد اور مفکرین اس سلسلے میں غور وفکر کر رہے تھے کہ قومی تعلیمی نظام کے خدوخال کیسے ہوں۔ کچھ لوگ تو برطانوی نظام تعلیم کے اندر ہی کچھ تبدیلیاں لانا چاہتے تھے اور یہ محسوس کرتے تھے کہ اسی نظام کا دائرہ اتنا وسیع کر دیا جائے کہ اس میں زیادہ سے زیادہ لوگ شامل ہو سکیں۔ کچھ لوگوں کی رائے تھی کہ ایک متبادل نظام تعلیم مرتب کیا جائے تا کہ تعلیم ایک سچے قومی تمدن کے دائرے میں رہ کر دی جا سکے۔ سچی قومی تہذیب کیا ہے؟ یہ کون طے کرے گا؟ 'قومی تعلیم' کیسی ہونی چاہیے اس پر بحث آزادی کے بعد بھی چلتی رہی۔

شکل 11 – کوئمبٹور میں واقع مشنری کے اسکول میں کھیلتے ہوئے بچے، ابتدائی بیسویں صدی

انیسویں صدی کے وسط تک عیسائی مبلغین اور ہندوستانی اصلاحی انجمنوں نے لڑکیوں کے لیے اسکول قائم کر لیے تھے۔

دوسرے مقام پر

تعلیم — مہذب بنانے کے ایک مشن کی حیثیت سے

ایجوکیشن ایکٹ 1870 کے نافذ ہونے تک انیسویں صدی کے بڑے حصے میں عام آبادی کے لیے تعلیم عام نہیں ہوئی تھی۔ بچہ مزدوری بڑے پیمانے پر عام تھی، غریب بچے اسکول نہیں بھیجے جاتے تھے کیوں کہ ان کی کمائی خاندان کی بقا کے لیے بڑی اہم تھی۔ اسکولوں کی تعداد محدود تھی۔ یا تو چرچ کے قائم کردہ اسکول تھے یا پھر دولت مند افراد کے۔ ایجوکیشن ایکٹ کے لاگو ہونے کے بعد ہی سرکاری اسکول کھلے اور لازمی تعلیم شروع ہوئی۔

ٹامس آرنلڈ جورگبی کے پرائیویٹ اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہو گئے تھے اس دور کے ایک بہت اہم ماہر تعلیم مفکر تھے۔ انھوں نے ثانوی اسکول کے لیے ایک ایسے نصاب کی حمایت کرتے ہوئے جس میں 2000 سال قبل لکھے گئے رومی اور یونانی کلاسکس کا تفصیلی مطالعہ شامل ہو، کہا تھا:

> عام طور پر ہمارے انگلش اسکولوں کے نصاب تعلیم میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے اس کا ایک سب سے بڑا فائدہ مجھے یہ لگتا ہے کہ یہ ہمارے ذہنوں کو تسلسل کے ساتھ ماضی سے وابستہ رکھتا ہے۔ ہم روز ایسی زبانوں، تاریخ اور ان لوگوں کے افکار سے واسطہ رکھتے ہیں جو تقریباً دو ہزار سال یا اس سے بھی زیادہ پہلے حیات تھے......

آرنلڈ کا خیال تھا کہ کلاسکس کا مطالعہ دماغ کو نظم وضبط میں رکھتا ہے۔ درحقیقت وقت کے اہم ماہرین تعلیم کا خیال ہے کہ یہ ڈسپلن بہت ضروری ہے کیوں کہ نوجوان عام طور پر غیر مہذب ہوتے ہیں جن کو مہذب بنانے اور کنٹرول میں رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ سماج کے مہذب افراد بننے کے لیے ان کو جائز و ناجائز اور مناسب و نامناسب رویوں کا ادراک ضروری ہے۔ تعلیم کا مقصد اور خاص طور پر اس تعلیم کا جو ذہنوں کو منظم کرتی ہے یہ ہے کہ وہ اس راستے کی جانب رہنمائی کرے۔

کیا آپ اس بارے میں اپنی کوئی رائے دیں گے کہ ان خیالات نے انگلینڈ کے غریب اور نوآبادیات کے 'دیسی لوگوں' کی تعلیم کے بارے میں عام فکر کو کتنا متاثر کیا ہوگا؟

تصور کیجیے

تصور کیجیے کہ آپ مہاتما گاندھی اور میکالے کے درمیان انگریزی تعلیم کے موضوع پر ہونے والے مباحثے میں شریک تھے۔ آپ نے جو مکالمے وہاں سنے ان کو ایک صفحے پر لکھیے۔

دوہرائیے

1۔ جوڑی ملائیے :

ولیم جونز	انگریزی تعلیم کا فروغ
رابندر ناتھ ٹیگور	قدیم تہذیبوں کا احترام
ٹامس میکالے	گرو
مہاتما گاندھی	فطری ماحول میں تعلیم
پاٹھ شالائیں	انگریزی تعلیم کے مخالف

2۔ بتائیے کہ درج ذیل بیانات میں سے کون صحیح ہے کون غلط:

(a) جیمز مل مستشرقین کا سخت مخالف تھا۔

(b) تعلیم پر 1854 کا مراسلہ ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کے لیے انگریزی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے حق میں تھا۔

(c) مہاتما گاندھی کا خیال تھا کہ خواندگی کا فروغ تعلیم کا سب سے اہم مقصد ہے۔

(d) رابندر ناتھ ٹیگور کے خیال میں بچوں کو سخت ڈسپلن کا پابند رہنا چاہیے۔

گفتگو کیجیے

3۔ ولیم جونز نے ہندوستانی تاریخ، فلسفے اور قانون کے مطالعے کی ضرورت کیوں محسوس کی؟

4۔ جیمز مل اور ٹامس میکالے نے یہ کیوں سوچا کہ ہندوستان کے لیے یوروپی تعلیم ضروری ہے؟

5۔ مہاتما گاندھی بچوں کو دستکاری کیوں سکھانا چاہتے تھے؟

6۔ مہاتما گاندھی نے یہ کیوں سوچا کہ انگریزی تعلیم نے ہندوستانیوں کو غلام بنا دیا؟

کر کے دیکھیے

7۔ اپنے دادا، دادی سے معلوم کیجیے کہ انھوں نے اسکول میں کیا کیا پڑھا تھا؟

8۔ اپنے اسکول یا اپنے علاقے کے کسی دوسرے اسکول کی تاریخ کے بارے میں معلومات حاصل کیجیے۔

2019-20

8

عورتیں، ذات پات اور اصلاحات

4824CH08

کیا کبھی آپ نے سوچا ہے کہ دو سو سال پہلے بچے کس طرح رہتے سہتے تھے؟ آج سماج کے درمیانی طبقوں کے خاندانوں کی اکثر لڑکیاں اسکول جاتی ہیں اور اکثر تو وہ لڑکوں کے ساتھ پڑھتی بھی ہیں۔ بڑے ہو کر بہت سی لڑکیاں کالج اور یونیورسٹی بھی جاتی ہیں اور اس کے بعد نوکری بھی کرتی ہیں۔ آج ان کو شادی سے پہلے بالغ ہونا قانوناً ضروری ہے اور قانون کے مطابق وہ جس سے چاہیں شادی کر سکتی ہیں چاہے وہ کسی ذات یا کسی فرقے سے تعلق رکھتا ہو۔ آج بیوہ عورتیں بھی شادی کر سکتی ہیں۔ مردوں کی طرح عورتیں بھی ووٹ دے سکتی ہیں اور الیکشن میں کھڑی ہو سکتی ہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ یہ حقوق عملی طور پر سب کو نہیں مل پاتے۔ غریب لوگوں کو تعلیم کے مواقع نہیں مل پاتے یا بہت کم ملتے ہیں۔ اکثر خاندانوں میں عورتیں اپنی مرضی سے اپنے شوہروں کا انتخاب نہیں کر سکتیں۔

شکل 1 – ستی، بالتھازر سالون کی بنائی پینٹنگ، 1813

یہ ستی کی ان بہت سی تصاویر میں سے ایک ہے جو ہندوستان آنے والے یوروپین مصوروں نے بنائی ہیں۔ ستی کی رسم کو مشرق کی بربریت کی مثال سمجھا جاتا ہے۔

دو سو سال پہلے حالات اور معاملات بہت مختلف تھے۔ اکثر بچوں کی کم عمری میں شادی کر دی جاتی تھی۔ ہندو اور مسلمان دونوں ایک سے زائد شادیاں کر سکتے تھے۔ ملک کے کچھ حصوں میں ان بیوہ عورتوں کی بڑی تعریف و تحسین ہوتی تھی جو اپنے شوہر کی چتا کے ساتھ خود بھی

جل جاتی تھیں۔ جو عورتیں اس طرح مرتی تھیں چاہے وہ اپنی مرضی سے یا بنا مرضی کے ان کو ''ستی'' کہا جاتا تھا۔ ستی کے معنی ہیں ''نیکوکار عورتیں''۔ عورتوں کے لیے جائداد کے حقوق بھی محدود تھے۔ اس کے علاوہ حقیقتاً عورتوں کو تعلیم حاصل کرنے کی آسانی میسر نہ تھی۔ ملک کے بہت سے حصوں میں لوگ یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ اگر عورت پڑھ لکھ لے گی تو بیوہ ہو جائے گی۔

عورتوں اور مردوں کے درمیان امتیازات برتنا ہی سماج میں پھیلی اکیلی برائی نہ تھی۔ بہت سے علاقوں میں لوگ ذات پات کی بنیاد پر بٹے ہوئے تھے۔ برہمن اور چھتریہ خود کو ''اعلیٰ ذات'' والا سمجھتے تھے۔ ان کے بعد دوسرے لوگوں جیسے تاجروں اور ساہوکاروں (جنھیں اکثر ویش کہا جاتا تھا) کا مرتبہ تھا۔ اس کے بعد کسانوں اور کاریگروں جیسے کپڑا بُننے والوں اور کُمہاروں کا نمبر آتا تھا (انھیں شودر کہا جاتا تھا)۔ سب سے پست طبقہ ان لوگوں کا تھا جو گاؤں اور شہروں کی صفائی کا کام کرتے تھے یا کوئی ایسا کام کرتے تھے جسے اونچی ذات والے ''گندا کام'' سمجھتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ان کو ذات کے اعتبار سے کوئی مرتبہ حاصل نہ تھا۔ اعلیٰ ذات کے لوگ ان میں سے بہت سے گروپوں کو ''اچھوت'' سمجھتے تھے۔ ان اچھوتوں کو مندروں میں جانے کی، اُن کنوؤں سے پانی نکالنے کی جن کو اعلیٰ ذات کے لوگ استعمال کرتے ہوں یا ان تالابوں میں نہانے کی جہاں اعلیٰ ذات کے لوگ نہاتے ہوں، بالکل اجازت نہ تھی۔ ان کو کمتر مخلوق سمجھا جاتا تھا۔

انیسویں اور بیسویں صدی کے طور طریقے اور نظریات میں آہستہ آہستہ تبدیلی آئی۔ آیئے دیکھیں کہ ایسا کیسے ہوا۔

تبدیلی لانے کی کوششیں

انیسویں صدی کی ابتدا سے ہی نمایاں طور پر واقع ہونے والے سماجی رسم و رواج اور طور طریقوں پر بحث و مباحثے شروع ہو گئے تھے۔ مواصلات کی نئی نئی شکلوں کی ترقی اس کا ایک اہم سبب تھی۔ پہلی بار کتابیں، اخبارات، رسالے اور کتابچے وغیرہ چھپے۔ یہ سب چیزیں ان قلمی کتابوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ سستی اور قابل رسائی تھیں جن کے بارے میں آپ ساتویں جماعت میں پڑھ چکے ہیں۔ اس طرح ان کو عام لوگ بھی لکھ پڑھ سکتے تھے اور اپنی

سرگرمی

چھاپہ خانہ سے پہلے کے اس دور میں جب کتابیں، اخبارات اور کتابچے وغیرہ فوری طور پر دستیاب نہیں ہوتے تھے تو کیا آپ ایسے طور طریقوں کو سوچ سکتے ہیں جن کے تحت سماجی رسم و رواج پر بحث کی جا سکتی ہو۔

زبان میں اپنے خیالات کا اظہار بھی کر سکتے تھے۔ اب نئے شہروں میں ہر قسم کے سیاسی، سماجی، اقتصادی اور مذہبی مسائل پر مرد (اور کبھی کبھی عورتیں بھی) بحث کر سکتے تھے۔ یہ بحث ومباحثے عام لوگوں تک پہنچتے تھے اور ان کا تعلق سماجی تبدیلیوں کی تحریکات سے جُڑ جاتا تھا۔

ہندوستانی مصلحین اور اصلاحی گروہ اکثر ایسی بحثیں شروع کرتے تھے۔ ایسے ہی ایک مصلح یا سماج سدھارک راجہ رام موہن رائے (1772-1833) تھے۔ انھوں نے ایک اصلاحی انجمن کلکتہ میں قائم کی تھی جو برہمو سبھا کے نام سے مشہور ہوئی (بعد میں اسے برہمو سماج کہا گیا)۔ راجہ رام موہن رائے جیسے لوگوں کو اسی لیے مصلح کہا جاتا ہے کیوں کہ وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ سماج میں تبدیلیاں ضروری ہیں اور سماجی ناانصافیوں سے چھٹکارا پانے کی ضرورت ہے۔ ان کے خیال میں ان تبدیلیوں کو یقینی بنانے کا سب سے بہترین طریقہ لوگوں کو اس بات پر آمادہ کرنا تھا کہ وہ پرانی روش چھوڑ دیں اور نیا طرز زندگی اختیار کریں۔

راجہ رام موہن رائے ملک میں مغربی تعلیم پھیلانا چاہتے تھے اور عورتوں کی آزادی اور مساوات کے حامی تھے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ کس طرح عورتوں کو گھریلو کام کاج کی ذمہ داری برداشت کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے، کس طرح گھر اور باورچی خانے میں ان کو محدود کر دیا جاتا ہے اور باہر جانے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ جس کے نتیجے میں وہ تعلیم حاصل نہیں کر پاتیں۔

شکل 2 – راجہ رام موہن رائے، ریمبرانڈ پیلے کی بنائی پینٹنگ، *1833*

بیواؤں کی زندگی میں تبدیلی

رام موہن رائے خاص طور پر ان مشکلات سے بہت متاثر تھے جو بیواؤں کو اپنی زندگی میں سہنی پڑتی تھیں۔ انھوں نے ستی رسم کے خلاف ایک مہم چلائی۔ رام موہن رائے سنسکرت، فارسی اور کئی دوسری ہندوستانی اور یوروپی زبانوں کے ماہر تھے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں یہ بتانے کی کوشش کی کہ بیوہ عورت کو جلانے کی رسم قدیم کتابوں میں کہیں نہیں ملتی۔ جیسا کہ آپ ساتویں باب میں پڑھ چکے ہیں کہ انیسویں صدی کے شروع میں بہت سے برطانوی عہدیداروں نے ہندوستانی رسوم اور روایات پر تنقید شروع کر دی تھی۔ وہ راجہ رام موہن رائے کی باتوں کو سننے کے بہت شائق تھے کیوں کہ وہ ایک صاحب علم کی حیثیت سے مشہور ومعروف تھے۔ 1829 میں ستی پر پابندی لگا دی گئی۔

راجہ رام موہن رائے نے جس حکمت عملی کو اختیار کیا تھا اسے بعد کے مصلحین نے بھی

شکل3 – ہک جھولا تہوار
اس مشہور تہوار میں بھکت ایک خاص قسم کے ابتلا یا اذیت کو برداشت کرتے تھے اور اس کو عبادت سمجھتے تھے۔ اپنی کھال میں ہک ڈال کر خود کو ایک پہیے پر جھلاتے تھے۔ انیسویں صدی کے شروع میں جب یوروپین عہدیداروں نے ہندوستانی رسم ورواج کو وحشیانہ بتانا شروع کیا تھا تو اس وقت اس رسم پر بھی سخت اعتراض کیے گئے تھے۔

اختیار کیا۔ جب کبھی وہ کسی ایسی رسم کو چیلنج کرتے جو نقصان دہ نظر آتی تو وہ قدیم مقدس کتابوں میں سے کوئی ایسا جملہ یا اشلوک نکال لاتے جو ان کے نقطۂ نظر کی تائید کرتا ہو۔ تب وہ یہ بات کہتے کہ یہ موجودہ عمل یا رسم قدیم روایات کے خلاف ہے۔

مثال کے طور پر ایک بہت مشہور مصلح ایشور چندر ودیا ساگر نے بھی یہ بتانے کے لیے قدیم کتابوں کا حوالہ دیا کہ عورتیں دوسری شادی کرسکتی ہیں۔ ان کی تجویز کو برطانوی عہدیداروں نے اختیار کرلیا اور 1856 میں ایک قانون بنایا گیا جس کی رو سے بیوائیں دوسری شادی کرسکتی تھیں۔ جو لوگ بیواؤں کی دوسری شادی کے خلاف تھے انھوں نے ودیا ساگر کی مخالفت کی اور ان کا بائیکاٹ بھی کیا۔

انیسویں صدی کے نصف آخر تک بیواؤں کی دوسری شادی کی تحریک ملک کے دوسرے حصوں میں پھیل گئی۔ مدراس پریزیڈنسی کے تیلگو زبان کے علاقوں میں ویراسالنگم پنتولو نے بیوہ عورتوں کی شادی کے لیے ایک انجمن بنائی۔ اسی زمانے میں نوجوان دانشور اور مصلحین نے بمبئی میں اس مقصد کے لیے کام کرنے کا عہد لیا۔ شمال میں دیانند سرسوتی نے آریہ سماج نامی ایک ایسوسی ایشن بنائی اور بیواؤں کی دوسری شادی کی حمایت کی۔

بہرحال ان بیواؤں کی تعداد جنھوں نے دوسری شادی کی کم ہی رہی۔ جنھوں نے شادی کی تھی ان کو سماج میں مقبولیت نہیں ملی اور قدامت پسندوں نے نئے قانون کی مخالفت کی۔

ماخذ 1

''ہم پہلے ان کو چتا سے باندھ دیتے ہیں''

رام موہن رائے نے اپنے خیالات کی اشاعت کے لیے بہت سے پمفلٹ (کتابچہ) چھپوائے۔ان میں سے کچھ پمفلٹ کسی روایتی عمل کے حامی اور طرفدار اور مخالف کے درمیان مکالموں کی شکل میں ہوتے تھے۔ستی کے اوپر ایسا ہی ایک ڈائیلاگ ذیل میں درج ہے:

ستی کا طرفدار:

عورتیں فطرتاً ناقص العقل ہوتی ہیں ان میں قوت فیصلہ کی کمی ہے اور وہ اعتماد کے لائق بھی نہیں ہوتیں..... ان میں سے بہت سی عورتیں اپنے شوہر کے مرنے پر ان کے ساتھ ہی مر جانا چاہتی ہیں؛ لیکن وہ بھڑکتی آگ سے بچ کر نکل بھاگنے کی کوشش نہ کریں اس کے لیے ہم پہلے ان کو چتا سے باندھ دیتے ہیں۔

ستی کا مخالف:

کیا کبھی آپ نے ان کو ایسا مناسب موقع فراہم کیا کہ وہ اپنی فطری صلاحیت کا اظہار کرتیں؟ پھر تم کس بنا پر ان پر سمجھ بوجھ سے عاری ہونے کا الزام لگاتے ہو۔اگر علم و دانش کی روشنی عطا کرنے کے بعد بھی کوئی شخص نہیں سمجھتا یا جو کچھ اس کو سکھایا گیا اس کو محفوظ نہیں رکھتا تو تم اس کو ناقص کہہ سکتے ہو۔لیکن اگر تم عورتوں کو تعلیم سے آراستہ ہی نہ کرو تو تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ ناقص ہیں۔

سرگرمی

یہ دلیل تو 175 سال پہلے دی گئی تھی۔آپ ایسی مختلف دلیلیں لکھیے جو آپ نے عورتوں کی قدر و قیمت کے بارے میں اپنے ماحول میں کہیں سنی ہوں۔اب خیالات میں کیا کیا تبدیلیاں آ گئی ہیں؟

لڑکیاں اسکول جانے لگیں

بہت سے مصلحین نے یہ محسوس کیا تھا کہ عورتوں کی حالت میں سدھار لانے کے لیے لڑکیوں کی تعلیم ضروری ہے۔

کلکتہ میں ودیا ساگر اور بمبئی میں بہت سے مصلحین نے لڑکیوں کے لیے اسکول قائم کیے۔جب انیسویں صدی کے وسط میں لڑکیوں کے لیے اسکول کھولے گئے تو بہت سے لوگ ان اسکولوں سے خائف بھی تھے۔ان کو یہ ڈر تھا کہ اسکول لڑکیوں کو گھر سے دور کر دیں گے اور ان کی گھریلو ذمہ داریوں کے انجام دینے میں حائل ہوں گے۔اس کے علاوہ، اسکول تک پہنچنے کے لیے لڑکیوں کو عوامی مقامات پر جانا پڑے گا۔بہت سے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ اس سے ان پر برے اثرات مرتب ہوں گے۔ان کے خیال میں لڑکیوں کو عوامی مقامات سے دور رہنا چاہیے۔اسی لیے انیسویں صدی میں تو تعلیم یافتہ عورتوں کو ان کے آزاد خیال والدین یا شوہروں نے گھر پر ہی پڑھایا۔کبھی کبھی عورتوں نے خود ہی پڑھا۔

شکل 4 – سوامی دیانند سرسوتی
دیانند سرسوتی نے 1875 میں آریہ سماج کی بنیاد ڈالی، اس تنظیم کا مقصد ہندو مت میں اصلاح لانا تھا۔

شکل 5 – ایشور چندر ودیا ساگر

آپ نے پچھلے سال اپنی کتاب سماجی اور سیاسی زندگی میں راش سندری دیوی کے بارے میں جو کچھ پڑھا تھا وہ یاد ہوگا؟ وہ ایک ایسی ہی خاتون تھیں جنھوں نے راتوں کو موم بتی کی لرزتی روشنی میں بہت خاموشی کے ساتھ لکھنا پڑھنا سیکھا تھا۔

اس صدی کے آخر میں آریہ سماج نے پنجاب میں اور جیوتی راؤ پھولے نے مہاراشٹر میں لڑکیوں کے لیے اسکول قائم کیے۔

شمالی ہندوستان میں مسلم اشرافیہ کے گھروں میں عورتیں قرآن پڑھنا سیکھتی تھیں۔ ان کو گھروں پر عورتیں پڑھانے آتی تھیں۔ ممتاز علی جیسے اصلاح پسندوں نے قرآنی آیات کی از سرِ نو تفسیر کے ذریعے عورتوں کی تعلیم کے دلائل دیے۔ انیسویں صدی کے آخر میں عورتوں کی تعلیم کے موضوع پر اردو میں ناول بھی لکھے جانے لگے۔ دیگر باتوں کے علاوہ ان کا مقصد عورتوں کو مہذب اور امور خانہ داری کے بارے میں ایک ایسی زبان میں شوق دلانا تھا جسے وہ سمجھتی تھیں۔

عورتوں نے عورتوں کے بارے میں لکھنا شروع کیا

بیسویں صدی کی ابتدا سے ہی مسلم خواتین جیسے بھوپال کی بیگمات نے عورتوں میں تعلیم کے فروغ کے لیے قابل ذکر کردار ادا کیا۔ انھوں نے علی گڑھ میں لڑکیوں کے لیے ایک پرائمری اسکول قائم کیا۔ ایک دوسری اہم خاتون بیگم رقیہ سخاوت حسین تھیں جنھوں نے پٹنہ اور کلکتہ میں مسلم لڑکیوں کے لیے اسکول شروع کیے۔ وہ قدامت پسند خیالات کی کٹر مخالف تھیں۔ وہ کہتی تھیں کہ ہر فرقے کے مذہبی رہنماؤں نے عورتوں کو کمتر مقام دیا ہے۔

شکل 6 – ہندو مہیلا ودیالیہ کی طالبات، 1875
جب انیسویں صدی میں پہلی مرتبہ لڑکیوں کے لیے اسکول قائم ہوئے تو عام خیال یہ تھا کہ لڑکیوں کے لیے نصاب تعلیم لڑکوں کے نصاب تعلیم کے مقابلے آسان ہو۔ اس زمانے میں ہندو مہیلا ودیالیہ وہ پہلا ادارہ تھا جس نے لڑکیوں کو بھی وہی تعلیم دی جو لڑکوں کو دی جا رہی تھی۔

1880 کی دہائی آتے آتے ہندوستانی عورتیں یونیورسٹیوں میں پہنچنے لگیں۔ ان میں کچھ ڈاکٹر بنیں اور کچھ ٹیچر۔ بہت سی عورتوں نے سماج میں عورتوں کے مقام و مرتبہ پر لکھنا اور اپنے مضامین چھپوانا شروع کیے۔ تارابائی شندے جو پٹنہ کی ایک تعلیم یافتہ خاتون تھیں اور جن کی گھر پر تعلیم ہوئی تھی انھوں نے ''استری پرش

تــلــنــا‘‘ (عورتوں اور مردوں کا موازنہ) نامی ایک کتاب شائع کی اور اس میں عورتوں اور مردوں کے درمیان سماجی امتیازات پر تنقید کی۔

سنسکرت کی ایک اسکالر پنڈتا راما بائی کا نظریہ تھا کہ ہندومت کا رویہ عورتوں کے لیے جابرانہ ہے۔ انھوں نے اعلیٰ ذات کی ہندو عورتوں کی تکلیف دہ حالت پر ایک کتاب لکھی۔ انھوں نے پونا میں ایک بیوہ خانہ کھولا اور اس میں ان بیوہ عورتوں کو رکھا جن کے ساتھ سسرال والے بہت برا سلوک کرتے تھے۔ اس گھر میں بیوہ عورتوں کو کچھ ایسے کاموں کی ٹریننگ بھی دی جاتی تھی جس سے وہ خود اپنی کفالت کر سکیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ان سب باتوں نے کٹر پنتھیوں کو ڈرا دیا۔ بہت سے قوم پرست ہندو یہ محسوس کرنے لگے کہ ہندو عورتیں مغربی طور طریقے اپنا رہی ہیں اور اس سے ہندو کلچر برباد ہو جائے گا اور ان کی خاندانی اقدار نابود ہو جائیں گیں۔ قدامت پسند مسلمان بھی ان تبدیلیوں سے پریشان تھے۔

شکل 7 – پنڈتا راما بائی

آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ انیسویں صدی کے آخر تک خود خواتین اصلاح کے لیے بہت جوش و خروش سے کام کرنے لگیں تھیں۔ انھوں نے کتابیں لکھیں، مجلّے شائع کیے، اسکول اور ٹریننگ سینٹر قائم کیے اور عورتوں کی انجمنیں بنائیں۔ بیسویں صدی کے آغاز سے ہی انھوں نے خواتین کے حق رائے دہی کے لیے قانون بنوائے، ان کی بہتر طبی دیکھ بھال اور اچھی تعلیم کے لیے سیاسی دباؤ ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ کچھ خواتین نے 1920 کی دہائی سے ہی قومی اور سماجی تحریکوں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ بیسویں صدی میں جواہر لعل نہرو اور سبھاش چندر بوس جیسے رہنماؤں نے عورتوں کی آزادی اور برابری کے مطالبات کی حمایت کی۔ قومی رہنماؤں نے وعدہ کیا کہ آزادی کے بعد عورتوں اور مردوں کو یکساں حق رائے دہی حاصل ہوگا۔ بہر حال انھوں نے عورتوں سے یہ درخواست کی کہ وہ آزادی ملنے تک انگریز مخالف جدو جہد میں حصہ لیں۔

ماخذ 2

عورت کا شوہر ایک بار مر گیا تو......

تارابائی شنڈے نے اپنی کتاب ’استــری پرش تلنا‘ میں لکھا ہے:

کیا عورت کو اپنی زندگی اتنی پیاری نہیں جتنی آپ کو اپنی زندگی عزیز ہے؟ کیا عورتیں کسی اور چیز سے بنی ہیں؟ کیا وہ خاک سے، مٹی سے کسی چٹان سے یا زنگ آلود لوہے سے بنی ہیں اور آپ کی تخلیق خالص سونے سے ہوئی ہے؟...... آپ پوچھتے ہیں کہ میرا کیا مطلب ہے؟ میرا مطلب یہی ہے کہ اگر ایک عورت کا شوہر مر گیا تو اب دنیا میں اس کا مقدر کیا ہے؟ ایک حجام آتا ہے اور اس کی زلفیں اور سر کے بال کاٹ جاتا ہے، محض آپ کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے کے لیے...... وہ کسی کی شادی بیاہ میں نہیں جا سکتی، کسی ایسی تقریب میں نہیں جا سکتی جس میں شادی شدہ عورتیں جاتی ہوں۔ یہ ساری پابندیاں کیوں؟ کیوں کہ اس کا شوہر مر گیا ہے۔ وہ بد نصیب ہے۔ اس کی پیشانی پر اس کا پھوٹا ہوا مقدر لکھا ہے۔ اس کا چہرہ نہ دیکھا جائے کیوں کہ وہ منحوس ہے۔

تارابائی شنڈے ’استری پرش تلنا‘

2019-20

چھوٹی عمر میں شادی کے خلاف قانون

عورتوں کی تنظیمیں بڑھ گئیں اوران موضوعات پرخوب لکھا جانے لگا تو اصلاحات نے بھی زور پکڑا۔ لوگوں نے ایک اور پختہ رسم-کم عمری میں شادی-کو چیلنج کیا۔ مرکزی قانون ساز اسمبلی(Central Legislative Assembly) میں بہت سے ایسے ہندوستانی ممبر تھے جنھوں نے کم عمری میں شادی روکنے کے لیے قانون بنانے میں بڑی جدوجہد کی۔ 1929 میں ''کم عمری شادی مخالف قانون'' (Child Marriage Restraint Act) پاس ہوا تو کوئی بحث اور مخالفت نہیں ہوئی جو اس سے پہلے دیکھنے میں آئی تھی۔ اس قانون کے تحت 18 سال سے کم عمر کے لڑکے اور 16 سال سے کم عمر کی لڑکی کی شادی نہیں ہوسکتی تھی۔ بعد میں یہ عمر بڑھا کر بالترتیب 21 سال اور 18 سال کردی گئی۔

شکل 8 – آٹھ سال کی دلہن

یہ بیسویں صدی کی شروعات کی ایک دلہن کی تصویر ہے۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ ہندوستان میں آج بھی ایسی 20 فی صد سے زیادہ لڑکیوں کی شادی ہوجاتی ہے جن کی عمر 18 سال سے کم ہوتی ہے؟

ذات پات اور سماجی اصلاح

ہم نے جن سماجی مصلحین کا ذکر کیا انھوں نے ذات پات کی نابرابریوں پر بھی تنقید کی ہے۔ رام موہن رائے نے ایک قدیم بودھ متن کا ترجمہ کیا ہے جو ذات پات کے خلاف تھا۔ پرارتھنا سماج نے بھکتی روایت کو قبول کیا۔ بھکتی روایت تمام ذاتوں کی روحانی برابری پر یقین رکھتی تھی۔ 1840 میں ذات پات کے خاتمہ کے لیے بمبئی میں پرم ہنس منڈلی قائم کی گئی۔ ان مصلحین اور اصلاحی تنظیموں کے ارکان میں بہت سے اعلیٰ ذات کے لوگ تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ یہ مصلحین خفیہ جلسوں میں کچھ ذاتوں کے ساتھ کھان پان اور چھوا چھوت سے متعلق ممنوعات کی خلاف ورزی بھی کرتے اور ان کی کوشش یہ ہوتی کہ وہ اپنی زندگیوں میں ان تعصّبات سے نجات پالیں جو ذات پات کے حوالے سے سماج میں پھیلے ہوئے ہیں۔

کچھ اور بھی ایسے لوگ تھے جنھوں نے ذات پات پر مبنی سماجی نظام کی ناانصافیوں پر سوال اٹھائے۔ انیسویں صدی کے دوران عیسائی مبلغین نے قبائلی اور ''نچلی'' ذات کے بچوں کے لیے اسکول قائم کیے۔ ان بچوں کو ایسے ذرائع نصیب ہوگئے کہ انھوں نے بدلتی دنیا میں اپنے لیے آگے بڑھنے کی راہ بنالی۔

اسی زمانے میں غریب لوگ گاؤں چھوڑ کر کام کی تلاش میں شہروں کی طرف آنا شروع ہوئے۔ شہروں میں نئے نئے کام شروع ہو رہے تھے۔ نئی نئی فیکٹریاں کھل رہی تھیں۔ میونسپلٹیوں میں بھی نوکریاں مل جاتی تھیں۔ شہروں کی توسیع کے بارے میں آپ چھٹے باب میں پڑھ چکے ہیں۔ اس سے مزدوروں کی مانگ میں اضافہ ہوا۔ نالیاں کھدیں، سڑکیں بنائی گئیں، مکانات کی تعمیر ہوئی اور شہروں کو صاف رکھنے کا کام بھی کیا گیا۔ ان سب کاموں کے لیے قلیوں، کھدائی مزدوروں، ڈھونے والے مزدوروں، اینٹ بچھانے والوں، نالی صاف کرنے والوں، جھاڑو دینے والوں، کمھاروں اور رکشہ چلانے والوں کی ضرورت پڑی۔ یہ مزدور کہاں سے حاصل ہوئے؟ گاؤں اور چھوٹے شہروں کے غریب لوگ جن میں بیشتر نچلی ذاتوں کے تھے ان بڑے شہروں کی طرف ہجرت کرنے لگے جہاں ایسے مزدوروں کی ضرورت تھی۔ کچھ لوگ آسام، ماریشس، ٹرینی داد اور انڈونیشیا کے باغانوں میں کام کرنے چلے گئے۔ نئی جگہوں پر کام بہت مشکل تھا لیکن نچلی ذاتوں کے غریب لوگوں نے اعلیٰ ذات کے ان

شکل 9 – انیسویں صدی میں قلیوں کے جہاز کا ایک منظر

قلیوں کے اس جہاز کا نام جان ایلن تھا۔ اس سے بہت سے مزدور ماریشس پہنچے جہاں انھوں نے بہت سے مختلف النوع کام کیے۔ ان میں سے اکثر مزدور نچلی ذاتوں کے تھے۔

جوتے کون بناتا تھا؟

روایتی طور پر چمڑے کا کام کرنے والوں کو نفرت سے دیکھا جاتا تھا۔ کیوں کہ وہ مردہ جانوروں کی کھال کا کام کرتے تھے اور کھالوں کو گندا سمجھا جاتا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران فوجوں کے لیے جوتوں کی بڑی مانگ ہوئی۔ چمڑے کا کام کرنے والی ذات کے خلاف بے جا تعصب کا مطلب یہی تھا کہ صرف چمڑے کا کام کرنے والے اور جوتا بنانے والے ہی فوج کے لیے جوتا بنانے کو تیار ہوئے۔ اس طرح انھوں نے اونچے داموں پر کام کیا اور بڑا فائدہ کمایا۔

شکل 10 – انیسویں صدی کے آندھرا پردیش کے مادیگا لوگ جوتا بناتے ہوئے

مادیگا موجودہ آندھرا پردیش کی ایک اچھوت ذات تھی۔ یہ لوگ کھالیں صاف کرنے اور دباغت دے کر ان کو سینے اور سینڈل بنانے میں ماہر تھے۔

زمینداروں کے جبرو استحصال اور ذلت سے بچنے کے لیے اس موقع کو غنیمت جانا جس کا وہ ہر روز شکار ہوتے تھے۔

اس کے علاوہ اور بھی کام تھے مثلاً فوج میں کام کے مواقع۔ مَہار (Mahar) لوگوں کو بھی اچھوت سمجھا جاتا تھا۔ ان لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو مَہار ریجیمنٹ میں کام ملا۔ دلت تحریک کے رہنما بھیم راؤ امبیڈکر کے والد ایک فوجی اسکول میں پڑھاتے تھے۔

شکل 11 – گجرات کے دُبلا لوگ بازار میں آم لے جاتے ہوئے

دبلا لوگ اعلیٰ ذات کے زمینداروں کے لیے کام کرتے تھے، ان کے لیے کھیتی باڑی کرتے اور ان کی گھر گرہستی کے مختلف قسم کے ذلت آمیز کام انجام دیتے تھے۔

کلاس روم کے اندر کوئی جگہ نہ تھی

بمبئی پریزیڈینسی میں 1829 تک بھی اچھوتوں کو سرکاری اسکولوں میں داخلہ نہیں ملتا تھا۔ جب ان لوگوں میں سے کچھ نے زور ڈالا تو ان کو کلاس روم سے باہر برآمدوں میں بیٹھنے اور سبق سننے کی اجازت ملی وہ بھی اس طرح کہ ان کے بیٹھنے سے وہ کمرے ''گندے'' نہ ہوں جہاں اعلیٰ ذات کے لڑکے بیٹھتے تھے۔

سرگرمی

1۔ تصور کیجیے کہ آپ ان طلبا میں سے ایک ہیں جن کو برآمدے میں بیٹھ کر سبق سننا پڑتا ہے۔ آپ کے دماغ میں کس قسم کے سوالات پیدا ہوں گے؟

2۔ کچھ لوگوں کا یہ خیال تھا کہ اچھوتوں کے لیے مکمل طور پر جاہل رہنے کے مقابلے میں یہ صورت بہتر تھی۔ کیا آپ اس خیال سے متفق ہیں؟

انصاف اور مساوات کے مطالبے

انیسویں صدی کے نصف آخر تک آتے آتے، ''غیر برہمن'' ذاتوں میں سے ہی بعض لوگوں نے رفتہ رفتہ ذاتی بھید بھاؤ کے خلاف تحریک شروع کی اور سماجی برابری اور انصاف کی مانگ کی۔

شکل 12 – شری نارائن گرو

وسطی ہندوستان کی ستنامی تحریک کی ابتدا گھاسی داس نے کی۔ جنھوں نے چمڑے کا کام کرنے والوں کو جمع کیا اور ان کے سماجی مرتبے کو بہتر بنانے کے لیے ایک تحریک چلائی۔ مشرقی بنگال میں ہری داس ٹھاکر کے متوا فرقے نے چنڈال کاشت کاروں کے درمیان

2019-20

کام کیا۔ ہری داس نے ان برہمن گرنتھوں پر سوال اٹھائے جو ذات پات کی حمایت میں تھے۔ موجودہ کیرالا میں اژاوا (Ezhava) نامی ذات کے ایک گرو شری نارائن گرو نے اپنے لوگوں کے درمیان اتحاد کے آدرشوں کی تلقین کی۔ انھوں نے ایک ہی فرقے یا ذات کے تمام لوگوں کے درمیان مساوات کی تبلیغ کی۔ انھوں نے ذات پات کی بنیاد پر لوگوں کے درمیان فرق کرنے کی مخالفت کی۔ ان کے نزدیک تمام انسانیت کی ایک ہی ذات ہے۔ ان کا ایک اہم قول تھا: ''اورو جاتی، اوروِمتم، اوروِ دیوم منشیانو'' (انسانیت کے لیے ایک ذات، ایک مذہب، ایک ایشور)۔

ان سب فرقوں کی بنیاد ایسے لوگوں نے ڈالی تھی جو غیر برہمن ذات سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے ایسی عادتیں اور ایسے کام بدلنے کی کوشش کی جن سے اعلیٰ ذات کے لوگوں کی نفرت بھڑکتی تھی۔ انھوں نے ادنیٰ ذات کے لوگوں میں عزت نفس کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کی۔

غلام گیری

جیوتی راؤ پھولے نچلی ذات کے بہت پر جوش لیڈر تھے۔ یہ 1827 میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے عیسائی مبلغین کے قائم کردہ اسکولوں میں تعلیم حاصل کی۔ بڑے ہو کر ذات سماج کی ناانصافیوں کے بارے میں ان کے خیالات کی تشکیل ہوئی۔ انھوں نے برہمنوں کے اس دعوے پر تنقید کی کہ وہ چوں کہ آریہ ہیں اس لیے دوسروں سے افضل ہیں۔ پھولے کی دلیل یہ تھی کہ آریہ بھی غیر ملکی تھے جو اس برصغیر میں باہر سے آئے تھے اور انھوں نے یہاں کے ان اصلی باشندوں کو شکست دے کر اپنی رعایا بنا لیا تھا جو یہاں ان کی آمد سے پہلے سے

شکل **13** – جیوتی راؤ پھولے

ماخذ 3

پھولے نے اس نوآبادیات مخالف قومیت (Anti-Colonial Nationalism) کی سخت تنقید کی جس کی اعلیٰ ذات کے لیڈر تبلیغ کیا کرتے تھے۔ انھوں نے لکھا ہے:

برہمنوں نے اپنے مذہب کی تلوار کو چھپا رکھا ہے جس سے وہ لوگوں کی خوشحالی کا گلا کاٹتے ہیں اور اس پر اپنے کو اس ملک کا بڑا محبِّ وطن ظاہر کرتے ہیں۔ یہ لوگ...... ہمارے شودروں، مسلمانوں اور پارسی نوجوانوں کو...... یہ درس دیتے ہیں کہ جب تک ہم اپنے ملک میں اونچ نیچ، تقسیم اور جھگڑے سے نجات نہیں پالیں گے اور متحد نہیں ہو جائیں گے اس وقت تک ہمارا...... ملک کوئی ترقی نہیں کر سکتا...... اتحاد سے ان کے مقاصد پورے ہو جائیں گے اور تب میں پھر اپنی جگہ اور تم اپنی جگہ رہو گے۔

جیوتی با پھولے کاشت کار کا چابک

سرگرمی

ماخذ 3 کو غور سے پڑھیے۔ جیوتی راؤ پھولے کے اس جملے ''میں پھر اپنی جگہ اور تم اپنی جگہ'' کا کیا مطلب ہے؟

رہتے سہتے تھے۔ جب آریوں کا غلبہ ہوگیا تو انھوں نے مفتوح قوم کو کمتر اور نچلی ذات کا سمجھا۔ پھولے کے مطابق ''اعلیٰ'' ذاتوں کو ان کی زمین اور اقتدار پر کوئی حق نہ تھا: درحقیقت زمین یہاں کے دیسی لوگوں کی تھی جنھیں نام نہاد نچلی ذات کے لوگ کہا گیا۔

پھولے نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ آریوں کی حکومت سے پہلے ایک ایسا سنہری زمانہ تھا جس میں جنگجو— کسان زمین میں کاشتکاری کرتے تھے اور انصاف و ایمانداری کے ساتھ مراٹھا دیہات پر حکومت کرتے تھے۔ انھوں نے یہ تجویز پیش کی کہ شودر (مزدوری کرنے والی ذاتیں) اور اتی شودر (اچھوت) ذات پات کے امتیاز کے خلاف متحد ہو جائیں۔ پھولے نے ستیہ شودھک سماج نامی تنظیم کی بنیاد ڈالی۔ اس تنظیم نے اس بات کی تبلیغ کی کہ سب ذاتیں برابر ہیں۔

پھولے نے 1873 میں ''غلام گیری'' نامی ایک کتاب لکھی تھی۔ اس نام کا مطلب ہے غلام بنانا۔ اس سے کوئی دس سال پہلے امریکہ میں خانہ جنگی (Civil War) ہوئی تھی جس کے نتیجے میں امریکہ میں غلامی کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ پھولے نے اپنی اس کتاب کو ان تمام امریکیوں کے نام منسوب کیا جنھوں نے غلاموں کو آزاد کرانے کے لیے جنگ کی تھی۔ اس طرح انھوں نے امریکہ کے کالے غلاموں اور ہندوستان کی نچلی ذاتوں کے حالات کے درمیان ایک تعلق پیدا کیا۔

جیسا کہ اوپر کی مثال سے ظاہر ہے پھولے نے ذات پات کے نظام پر تنقید کرتے ہوئے نابرابری کی تمام اقسام کی مخالفت کی ہے۔ اعلیٰ ذات کی خواتین کی حالت ہو یا مزدوروں کے دکھ درد یا پھر نچلی ذاتوں کی ذلت، پھولے سبھی کے لیے فکر مند تھے۔ ذات پات کی اصلاح کی یہ تحریک بیسویں صدی میں بھی جاری رہی اور ڈاکٹر بی آر امبیڈکر مغربی ہندوستان میں اور ای وی راماسوامی نائکر جنوبی ہندوستان میں اس تحریک کے روح رواں رہے۔

مندروں میں کون جا سکتا تھا؟

امبیڈکر ایک مہار خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ بچپن میں انھیں اپنی روزمرہ کی زندگی میں ذات پات کے تعصّبات کا شکار ہونا پڑا۔ اسکول میں ان کو کلاس روم سے باہر زمین پر بیٹھنا پڑتا تھا اور انھیں ان نلوں سے پانی پینے کی اجازت نہیں تھی جن سے اعلیٰ ذات کے بچے پانی پیتے تھے۔ اسکول کی تعلیم پوری کرنے کے بعد انھیں امریکہ جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے

لیے وظیفہ مل گیا۔ 1919 میں جب وہ واپس آئے تو انھوں نے اپنے معاصر سماج میں ''اعلیٰ'' ذات کی قوت کے بارے میں تفصیل سے لکھا۔

1927 میں امبیڈکر نے مندروں میں داخلے کی تحریک شروع کی۔ اس تحریک میں ان کی مَہار برادری کے لوگوں نے شرکت کی۔ جب دلتوں نے مندروں کے کنویں کا پانی استعمال کرنا شروع کیا تو برہمن مہنتوں کو بہت غصہ آیا۔

امبیڈکر نے 1927 سے 1935 تک مندروں میں داخلے کے لیے تین تحریکوں کی رہنمائی کی۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ لوگ سماج کے اندر ذات پات کی بنیاد پر تعصّبات کی قوت کا اندازہ لگالیں۔

ماخذ 4

''ہم بھی انسان ہیں''

1927 میں امبیڈکر نے کہا تھا:

ہم کنویں تک صرف یہ ثابت کرنے کے لیے جانا چاہتے ہیں کہ دیگر لوگوں کی طرح ہم بھی انسان ہیں.....ضرورت یہ ہے کہ ہندو سماج دو اصولوں کی بنیاد پر پہچانا جائے اور وہ ہیں ایک برابری اور دوسرے ذات پات کا نہ ہونا۔

غیر برہمن تحریک

بیسویں صدی کی ابتدا میں غیر برہمن تحریک شروع ہوئی۔ اس کی شروعات ان غیر برہمن ذاتوں نے کی جنھوں نے تعلیم حاصل کر لی تھی اور جن کے پاس دھن دولت تھی۔ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ برہمن شمال کے ان آریہ حملہ آوروں کے وارث ہیں جنھوں نے اس علاقے کے اصلی باشندوں -دیسی دراوڑی نسلوں- کی زمینوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ ان غیر برہمن ذاتوں نے برہمنوں کے اقتدار کو بھی چیلنج کیا۔

شکل 14– مدورئی مندر کا دروازہ، ٹامس ڈینیل نے بنائی تصویر، 1792

جب تک مندروں میں داخلے کی تحریک شروع نہیں ہوئی تھی اس وقت تک اچھوتوں کو ایسے کسی دروازے پر جانے کی اجازت نہیں تھی۔

ای۔وی۔راما سوامی نائیکر جنھیں پیریار کہا جاتا تھا، کا تعلق ایک متوسط طبقے کے خاندان سے تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ اپنی ابتدائی زندگی میں ایک سنیاسی تھے اور انھوں نے بہت احتیاط سے سنسکرت کی مذہبی تحریروں کا مطالعہ کیا تھا۔ بعد میں وہ کانگریس کے ممبر ہو گئے لیکن کانگریس کی ممبری انھوں نے اس وقت چھوڑ دی جب قوم پرستوں کی ایک دعوت میں بیٹھنے کا انتظام ذات پات کی بنیاد پر کیا گیا یعنی اس طرح کہ نچلی ذات کے لوگ اونچی ذات کے لوگوں سے فاصلے پر بیٹھیں۔ جب پیریار کو یہ یقین ہو گیا کہ اچھوتوں کو اپنی عزت و وقار کی لڑائی خود لڑنی ہے تو انھوں نے ''تحریک خود احترامی'' (Self Respect Movement) کی بنیاد ڈالی اور بتایا کہ تمل اور دراوڑی کلچر کے اصل رکھوالے اچھوت ہیں جنھیں برہمنوں نے اپنی رعایا بنا لیا تھا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ تمام مذہبی رہنما سمجھتے ہیں کہ سماجی تقسیم اور نابرابری خدا کی طرف سے ہے چنانچہ اچھوتوں کو سماجی برابری حاصل کرنے کے لیے تمام مذاہب سے آزاد کرانا ہوگا۔

پیریار ہندو مذہبی کتابوں خاص طور پر منو کے قوانین، بھگوت گیتا اور راماین وغیرہ پر سخت اور کھلم کھلا تنقید کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ نچلی ذاتوں پر برہمنوں کے اقتدار اور عورتوں پر مردوں کے تسلط کو برقرار رکھنے کے لیے ان مذہبی کتابوں کا استعمال کیا گیا ہے۔

ان دعووں اور خیالات کو چیلنج بھی کیا گیا۔ نچلی ذات کے رہنماؤں کی پُر جوش تقریروں، تحریروں اور تحریکوں نے اونچی ذات کے قومی رہنماؤں کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن ساتھ ہی متعصب ہندو سماج نے اس کی مخالفت میں بھی ردِ عمل ظاہر کیا اور شمال میں سناتن دھرم اور بھارت دھرم مہامنڈل کی بنیاد ڈالی اور بنگال میں برہمن سبھا جیسی تنظیمیں قائم کیں۔ ان تنظیموں کا مقصد ہندو مت کی بنیادوں میں ذات پات کے امتیاز کو برقرار رکھنا اور یہ دکھانا تھا کہ ذات پات کے نظام کا تقدس مذہبی صحیفوں سے ثابت ہے۔ ذات پات پر مباحثوں اور جدو جہد کا سلسلہ نوآبادیاتی دور کے بعد بھی جاری رہا اور آج ہمارے زمانے میں بھی جاری ہے۔

شکل **15**–ای۔ وی۔ راما سوامی نائیکر (پیریار)

ماخذ 5

پیریار بنام خواتین

پیریار نے لکھا:

صرف ''تارا مکرتم'' جیسے الفاظ کے عام ہونے سے عورتیں اپنے شوہروں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن گئی ہیں۔ وہ باپ جو اپنی بیٹیوں سے یہ کہتے ہیں کہ تم اپنے شوہروں کو تحفے میں دی جا رہی ہو اور تمہارا تعلق شوہر کے گھر سے ہے، ہم ان سے تعلق توڑتے ہیں...... یہ نتیجہ ہے سنسکرت کے ساتھ ہماری وابستگی کا۔

پیریار، پیریار چنتانائیکل میں شائع

سرگرمی

آج بھی ذات پات ایک متنازعہ موضوع کیوں ہے؟ آپ کے خیال میں نوآبادیاتی دور میں ذات پات کے خلاف سب سے اہم تحریک کون سی تھی؟

اصلاح کی تنظیمیں

شکل **16**–کیشب چندر سین یہ برھمو سماج کے اہم رہنماؤں میں سے تھے۔

برہموسماج

برہموسماج کی بنیاد 1830 میں پڑی۔ یہ سماج مورتی پوجا اور قربانی کی تمام صورتوں کا مخالف تھا، اپنشدوں پر یقین رکھتا تھا اور اپنے ممبران کو کسی بھی مذہبی رسوم پر تنقید کرنے سے منع کرتا تھا۔ یہ سماج مذاہب — خاص طور پر ہندومت اور عیسائیت — کے آدرشوں کا مطالعہ تنقیدی نگاہ سے کرتا تھا اور ان کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کو دیکھتا تھا۔

ڈی روزیو اور اس کی ینگ بنگال تحریک

شکل **17** – ہنری ڈی روزیو

ہنری لوئس ویویان ڈی روزیو (Henry Louis vivian Derozio) 1820 کی دہائی میں کلکتے کے ہندو کالج میں ٹیچر تھے۔ ان کے خیالات انتہا پسندانہ تھے اور وہ اپنے شاگردوں کو بھی اس بات کے لیے آمادہ کرتے تھے کہ وہ ہر صاحبِ اختیار پر سوال اٹھا سکیں۔ ان کی تنظیم ''ینگ بنگال موومنٹ'' کے طلبا نے رسوم وروایات کو تنقید کا نشانہ بنایا، عورتوں کے لیے تعلیم کا مطالبہ کیا اور تقریر وتحریر کی آزادی کی مہم چلائی۔

رام کرشن مشن اور وویکانند

اس مشن کا نام، سوامی وویکانند کے گرو رام کرشن پرم ہنس کے نام پر پڑا۔ یہ مشن سماجی خدمت اور اخلاصِ عمل کے ذریعے نجات پر زور دیتا تھا۔

شکل **18**– سوامی وویکانند

پرارتھنا سماج

پرارتھنا سماج کا قیام بمبئی میں 1867 میں ہوا۔ یہ سماج ذات پات کی پابندیوں اور کم عمری میں شادی کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ عورتوں کو تعلیم یافتہ بنانا چاہتا تھا اور بیوہ عورتوں کی شادی پر پابندی ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس سماج کے مذہبی جلسوں میں ہندو، بودھ اور عیسائیوں کے مذہبی صحیفوں پر بحث ہوتی تھی۔
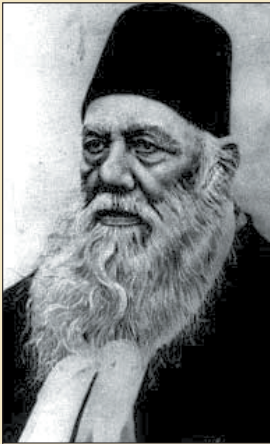
شکل **19**– سرسید احمد خان

وید سماج

وید سماج مدراس (چینئی) میں 1864 میں قائم ہوا۔ یہ برہموسماج سے متاثر تھا۔ اس نے ذات پات کے خاتمے کے لیے کام کیا اور بیواؤں کی شادی اور عورتوں کی تعلیم کی پُر زور حمایت کی۔ اس کے ممبر ایک خدا پر یقین رکھتے تھے کٹر پنتھی ہندومت کے توہمات اور مذہبی رسومات کی مذمت کرتے تھے۔

علی گڑھ تحریک

سید احمد خاں نے علی گڑھ میں 1875 میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج، قائم کیا جو بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

بنا۔اس ادارے میں مسلمانوں کے لیے مغربی سائنس اور جدید تعلیم کا انتظام کیا گیا۔جیسا کہ معلوم ہے کہ علی گڑھ تحریک نے تعلیمی اصلاحات کے میدان میں غیر معمولی اثرات چھوڑے۔

سِنگھ سبھا تحریک

سنگھ سبھائیں سکھوں کی پہلی اصلاحی تنظیمیں تھیں۔ یہ 1873 میں امرتسر میں اور 1879 میں لاہور میں قائم ہوئیں۔ ان سبھاؤں کا مقصد سکھوں کو توہمات، ذات پات اور غیر سکھ رسوم ورواج سے بچانا تھا۔ ان تنظیموں نے سکھوں میں تعلیم کو فروغ دیا اور بیش تر جدید تعلیم اور سکھ تعلیمات کو یکجا کر دیا۔

شکل **20** – امرتسر کا خالصہ کالج، اسے سنگھ سبھا تحریک کے رہنماؤں نے 1892 میں قائم کیا

دوسرے مقام پر

سیاہ فام غلام اور سفید فام باغان مالک

آپ پڑھ چکے ہیں کہ جیوتی راؤ پھولے نے اپنی کتاب 'غلام گیری' میں ذات پات کی سختیوں اور امریکہ میں غلامی کے کاموں کے درمیان کس طرح ایک تعلق پیدا کیا۔ غلامی کا یہ نظام کیا تھا؟

سترھویں صدی میں جب یورپ کے تاجر اور دنیا کی تلاش میں نکلنے والے لوگ افریقہ پہنچے تو اسی وقت سے غلاموں کی تجارت شروع ہوگئی، کالے لوگوں کو پکڑا گیا اور ان کو افریقہ سے امریکہ لایا گیا۔ اور وہاں سفید فام باغان مالکوں کے ہاتھوں فروخت کیا گیا۔ یہاں ان کو کپاس اور دیگر چیزوں کے کھیتوں پر کام کرنا پڑا۔ یہ باغان بیشتر امریکہ کی جنوبی ریاستوں میں تھے۔ ان باغان میں صبح سے شام تک ان لوگوں کو کام کرنا پڑتا تھا۔ کام ادھورا رہ جاتا یا ٹھیک نہ ہوتا تو سزا ملتی، کوڑے کھانے پڑتے یا کسی اور قسم کی اذیت کا سامنا کرنا پڑتا۔

شکل **21** – غلاموں کی خرید و فروخت، جنوبی کارولینا، امریکہ، 1856

اس تصویر میں آپ کو وہ خریدار نظر آرہے ہیں جو نیلامی میں غلاموں کو ٹھونک بجا کر دیکھ رہے ہیں۔

گورے اور کالے بہت سے لوگوں نے منظم مظاہروں کے ذریعے اس غلامی نظام کی مخالفت کی۔ غلامی نظام کی مخالفت کے دوران انھوں نے 1776 کے امریکی انقلاب کی دہائی دی اور کہا ''اے امریکیو! اپنے انقلاب کے منشور پر نظر ڈالو۔ تم اپنی زبان تو سمجھتے ہو؟ ابراہم لنکن نے اپنی گیٹس برگ (Gettysburg) کی پُر اثر تقریر میں کہا تھا کہ جن لوگوں نے غلامی کے خلاف جنگ کی تھی انھوں نے دراصل آزادی کے حصول کے لیے جنگ کی تھی۔ انھوں نے لوگوں سے نسلی برابری کے لیے جدوجہد کرنے کو کہا تاکہ ''عوام کی حکومت، عوام کے لیے اور عوام کے ذریعے'' روئے زمین سے ختم نہ ہونے پائے۔

تصور کیجیے

تصور کیجیے کہ آپ رقیہ حسین کے قائم کردہ اسکول میں ایک ٹیچر ہیں۔ 20 لڑکیاں آپ کی نگرانی میں ہیں۔ اسکول میں کسی دن منعقد ہونے والے کسی مباحثے کا بیان کیجیے۔

دوھرائیے

1۔ مندرجہ ذیل لوگوں نے کن سماجی نظریات کی حمایت کی۔

رام موہن رائے

دیانند سرسوتی

ویریسالنگم پنتولو

جیوتی راؤ پھولے

پنڈتا رامابائی

پیریار

ممتاز علی

ایشور چندر ودیا ساگر

2۔ بتائیے کہ یہ بیانات صحیح ہیں یا غلط:

(a) جب انگریزوں نے بنگال پر قبضہ کرلیا تو انھوں نے شادی، تہنیت (گود لینا) جائداد کی وراثت وغیرہ کے بارے میں بہت سے نئے قانون بنائے۔

(b) سماجی معاملات میں اصلاحات کرنے کے لیے سماجی مصلحین کو قدیم مذہبی کتابیں مسترد کرنی پڑیں۔

(c) سماجی مصلحین کو ملک کے تمام طبقات کے لوگوں کی حمایت حاصل تھی۔

(d) کم عمری شادی پابندی ایکٹ (Child Marriage Restraint Act) 1829 میں پاس ہوا۔

گفتگو کیجیے

3۔ نئے قوانین کے فروغ میں قدیم مذہبی کتابوں کے علم نے مصلحین کی کیا مدد کی؟

4۔ لڑکیوں کو اسکول نہ بھیجنے کے لیے لوگ کیا کیا دلائل دیتے تھے؟

5۔ ملک میں بہت سے لوگوں نے عیسائی مشنریوں پر حملے کیوں کیے؟ کیا دیگر لوگوں نے ان کی حمایت کی؟ اگر کی تو کس بنیاد پر؟

6۔ برطانوی دورِ حکومت میں وہ کون سے نئے مواقع تھے جو ''نچلی'' سمجھی جانے والی ذاتوں کو حاصل ہوئے؟

7۔ سماجی مصلح جیوتی راؤ نے سماج میں ذات پات اور نابرابری پر تنقید کے کیا دلائل دیے؟

8۔ پھولے نے اپنی کتاب غلام گیری کو اس امریکی تحریک کے نام کیوں منسوب کیا جو غلاموں کو آزاد کرانے کے لیے تھی؟

9۔ مندر میں جانے کی جو تحریک امبیڈکر نے شروع کی تھی اس کا کیا مقصد تھا؟

10۔ جیوتی راؤ پھولے اور راما سوامی نایکر قومی تحریک پر کیوں تنقید کرتے تھے؟ کیا ان کی تنقید سے کسی طرح قومی جدوجہد کو کچھ فائدہ بھی پہنچا؟

9 قومی تحریک: 1870 کی دہائی سے 1947 تک

شکل 1 – بھارت چھوڑو تحریک کے دوران مظاہرین پر پولیس کا آنسو گیس کا استعمال

پچھلے ابواب میں ہم مندرجہ ذیل باتوں کے بارے میں پڑھ چکے ہیں:

- ریاستوں پر برطانیہ کی فتح اور قبضہ
- نئے قوانین اور انتظامی اداروں کی شروعات
- کسانوں اور قبائلی لوگوں کی زندگی میں تبدیلیاں
- انیسویں صدی میں تعلیمی تبدیلیاں
- عورتوں کی حالت کے بارے میں بحث ومباحثے
- ذات پات کے لیے چیلنج
- سماجی اور مذہبی اصلاحات
- 1857 کا انقلاب اور اس کے اثرات
- دستکاری کا زوال اور صنعتوں کا فروغ

مندرجہ بالا موضوعات کے بارے میں آپ نے جو کچھ پڑھا اس کی بنیاد پر کیا آپ

سمجھتے ہیں کہ ہندوستانی برطانوی حکومت سے بیزار تھے؟ اگر ایسا تھا تو مختلف گروہ اور طبقات کس طرح غیر مطمئن تھے؟

قوم پرستی کا ظہور

اوپر بیان کیے گئے واقعات نے لوگوں کو یہ اہم سوال پوچھنے پر مجبور کر دیا کہ یہ ملک ہندوستان ہے کیا؟ اور کس کے لیے ہے؟ اس سوال کا جو جواب بتدریج ملا وہ یہ تھا: ہندوستان کا مطلب ہے ہندوستان کے لوگ چاہے وہ کسی طبقے، رنگ، ذات، نسل، زبان یا جنس سے تعلق رکھتے ہوں۔ یہ ملک اور اس کے وسائل اور اس کے نظام یہاں رہنے والے تمام لوگوں کے لیے ہیں۔ اس جواب سے یہ بیداری آئی کہ ہندوستان کے وسائل اور اس ملک کے لوگوں کی زندگی پر ابھی برطانوی لوگوں کا اختیار ہے اور جب تک یہ اختیار ختم نہیں ہوگا ہندوستان ہندوستانیوں کا نہیں ہوسکتا۔

وہ سیاسی انجمنیں جو 1850 کے بعد اور خاص طور پر 1870 اور 1880 کی دہائیوں میں قائم ہوئیں انھوں نے خاص طور پر اس بیداری کا احساس دلایا۔ ان میں سے اکثر انجمنیں انگریزی داں پیشہ ور جیسے وکلا کی زیر قیادت تھیں۔ ان میں پونا سارو جنک سبھا، انڈین ایسوسی ایشن، مدراس مہاجن سبھا، ممبئی پریزیڈنسی ایسوسی ایشن اور انڈین نیشنل کانگریس بہت اہم تھیں۔

''پونا سارو جنک سبھا'' کے نام پر غور کیجیے۔ سارو جنک کا لفظی مفہوم ہے ''سب کا'' یا سب کے لیے (سارو=سب + جنک=لوگوں کا)۔ اگرچہ ان میں سے بہت سی انجمنیں ملک کے الگ الگ حصوں میں کام کرتی تھیں لیکن ان کے مقاصد کسی خاص خطے یا کسی خاص فرقے یا طبقے کے لیے نہیں تھے بلکہ ہندوستان کے سبھی لوگوں کے لیے تھے۔ ان کے کام کا مطمح نظر یہ تھا کہ **اقتدار اعلیٰ** (Sovereignty) ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ہو۔ اقتدار لوگوں کا ہو یہی چیز جدید شعور کی بیداری اور قوم پرستی کی کلیدی خصوصیت ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ ان کا یقین اس بات پر تھا کہ ہندوستانی لوگ اپنے فیصلے خود لینے کے لیے با اختیار ہوں۔

اقتدار اعلیٰ – کسی باہری دخل اندازی کے بغیر آزادانہ کام کرنے کا اختیار

برطانوی حکومت سے بیزاری 1870 اور 1880 کی دہائیوں میں اور شدید ہوگئی۔ 1878 میں آرمس ایکٹ (Arms Act) پاس ہوا جس کے تحت ہندوستانیوں کو اسلحہ رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ اسی سال حکومت پر تنقید کرنے والوں کو خاموش رکھنے کے لیے

ورنا کیولر پریس ایکٹ نافذ ہوا۔ اس قانون کے تحت حکومت اب اس بات کا اختیار حاصل ہو گیا کہ اگر اخبارات میں کوئی بات ''قابل اعتراض'' چھپے تو حکومت اخبار کے تمام اثاثے مع پرنٹنگ پریس کے ضبط کر سکتی ہے۔ 1883 میں حکومت نے البرٹ بل (Ilbert Bill) پیش کرنے کی کوشش کی تو بڑا ہنگامہ ہوا۔ اس بل کے تحت برطانوی نژاد لوگوں کا مقدمہ ہندوستانی نژاد ججوں کی عدالت میں چلایا جا سکتا تھا۔ اس بل کا مقصد ملک میں ہندوستانی اور یورپی ججوں کے درمیان برابری پیدا کرنا تھا۔ لیکن جب انگریزوں نے مخالفت کی اور بل واپس لینے کے لیے حکومت پر زور ڈالا تو ہندوستانی غصے میں بپھر گئے۔ اس واقعہ سے ہندوستان میں اہل برطانیہ کے نسلی تعصّبات کھل کر سامنے آ گئے۔

مبلغ (Publicist) – جو محض معلومات کو مشتہر کر کے، رپورٹیں لکھ کے اور جلسوں میں تقریر کر کے کسی نظریے یا خیال کی تشہیر کرتا ہے

تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی ایک کل ہند تنظیم کی ضرورت 1880 سے ہی محسوس کی جانے لگی تھی لیکن البرٹ بل کے ہنگامے نے اس ضرورت کو اور شدید کر دیا۔ دسمبر 1885 میں جب تمام ملک کے 72 مندوبین بمبئی میں اکٹھا ہوئے تو انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آیا۔ شروع میں اس کے اکثر رہنما— دادا بھائی نوروجی، فیروز شاہ مہتہ، بدرالدین طیب جی، ڈبلیو۔ سی۔ بنرجی، سریندر ناتھ بنرجی، رومیش چندر۔ دت اور ایس۔ سبرامنیم ایرّ اور دیگر لوگ بمبئی اور کلکتے سے تعلق رکھتے تھے۔ نوروجی جو ایک **مبلغ** اور تاجر تھے اور لندن میں مقیم ہو گئے تھے اور کچھ عرصے تک برطانوی پارلیمنٹ کے ممبر بھی رہے تھے، انھوں نے نوجوان قوم پرستوں کی رہنمائی کے فرائض انجام دیے۔ ایک ریٹائرڈ برطانوی عہدیدار نے جن کا نام اے۔ او۔ ہیوم تھا مختلف خطوں کے ہندوستانیوں کو متحد کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

ماخذ 1

کانگریس کے لیے کس نے کیا کہا؟

اخبار دی انڈین میرر نے جنوری 1886 میں لکھا تھا:

بمبئی کی پہلی نیشنل کانگریس .... ہمارے ملک کی آئندہ پارلیمنٹ کی بنیاد ہوگی اور ہمارے اہل وطن کے لیے ناقابل تصور طور پر مفید نتائج کی حامل ہوگی۔

بدرالدین طیب جی نے 1887 میں کانگریس کے صدر کی حیثیت سے کہا تھا:

کانگریس ہندوستان کے کسی ایک طبقے یا فرقے کے نمائندوں کی جماعت نہیں ہے بلکہ یہ ہندوستان کے تمام مختلف فرقوں کی جماعت ہے۔

شکل 2 – دادا بھائی نوروجی

نوروجی کی کتاب " ہندوستان میں افلاس اور غیر برطانوی حکومت" میں برطانوی حکومت کے اقتصادی اثرات پر تنقید کی گئی تھی۔

ملک کی تشکیل

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ پہلے بیس برسوں میں کانگریس اپنے مقاصد اور طریق کار میں ''اعتدال پسند'' (moderate) تھی۔ اس دوران کانگریس نے حکومت اور انتظامیہ میں کام کرنے والے ہندوستانیوں کے حق میں زبردست آواز اٹھائی۔ اس نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ مجالس قانون ساز (Legislative Councils) کو زیادہ نمائندگی اور زیادہ اختیارات حاصل ہوں اور جن صوبوں میں یہ مجالس نہیں ہیں وہاں ان کی تشکیل کی جائے۔ کانگریس نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ ہندوستانیوں کو حکومت میں اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اس نے یہ مطالبہ کیا کہ سول سروسز کے امتحانات لندن کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں بھی منعقد ہوں۔

انتظامیہ کو ہندوستانی بنانے کا مطالبہ دراصل نسل پرستی کے خلاف تحریک کا ایک حصہ تھا کیوں کہ اس وقت اکثر اہم نوکریوں پر سفید فام لوگوں کی اجارہ داری تھی اور برطانوی لوگوں نے عام طور پر یہ فرض کر رکھا تھا کہ ہندوستانیوں کو ذمہ داریوں سے بھری نوکریاں نہیں دی جا سکتیں۔ برطانوی افسران چوں کہ اپنی تنخواہ کا بڑا حصہ اپنے وطن بھیج دیتے تھے اس لیے امید یہ تھی کہ نوکریوں کو ہندوستانی بنانے سے انگلینڈ کو بھیجی جانے والی دولت میں کمی آجائے گی۔ دیگر مطالبات میں عدلیہ کی انتظامیہ سے علاحدگی، آرمس ایکٹ کی منسوخی (Repeal) اور تحریر و تقریر کی آزادی شامل تھے۔

ابتدا میں کانگریس نے بہت سے اقتصادی مسائل اٹھائے۔ اس نے اعلانیہ کہا کہ برطانوی حکومت ہندوستان میں افلاس اور قحط سالی کا سبب ہے۔ زمین کے محصول میں اضافے نے کسانوں اور زمینداروں کو کھوکھلا کر دیا ہے اور ہندوستان سے اناج کی یورپ کو برآمد کے نتیجے میں یہاں اناج کی قلت پیدا ہوگئی ہے۔ کانگریس نے محصول میں کمی، فوجی اخراجات میں کمی اور آبپاشی کے لیے مزید فنڈ کے استعمال کا مطالبہ کیا۔ کانگریس نے نمک ٹیکس، بیرون ملک میں کام کرنے والے ہندوستانیوں کے ساتھ بہتر سلوک اور محکمۂ جنگلات کی مداخلت کی وجہ سے جنگلات میں رہنے والے لوگوں کی مشکلات وغیرہ کے بارے میں تجاویز پاس کیں۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگرچہ کانگریس تعلیم یافتہ اعلیٰ طبقے کی جماعت تھی لیکن کانگریس نے صرف زمینداروں، صنعت کاروں اور پیشہ وارانہ گروہوں کی ہی بات نہیں کی۔

اعتدال پسند رہنما برطانوی حکومت کی غیر منصفانہ روش کے بارے میں ایک عام

سرگرمی

کانگریس شروع سے ہی تمام ہندوستانیوں کے لیے بولتی اور انھیں کے نام پر سب کچھ کرتی تھی۔ وہ ایسا کیوں کرتی تھی؟

منسوخ کرنا (Repeal) – کسی قانون کو ختم کرنا، کسی بھی قانون کے جواز (validity) کو سرکاری طور پر ختم کرنا

بیداری پیدا کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اخبارات شائع کیے، مضامین لکھے اور یہ دکھایا کہ برطانوی حکومت ملک کو اقتصادی بدحالی کی طرف لے جا رہی ہے۔ انھوں نے اپنی تقریروں میں برطانوی حکومت پر تنقید کی اور عوامی رائے کو ہموار کرنے کے لیے ملک کے مختلف حصوں میں نمائندے بھیجے۔ انھیں اس بات کا احساس تھا کہ برطانوی لوگ آزادی اور انصاف کا احترام کرتے ہیں اور وہ ہندوستانیوں کے جائز مطالبات کو مان لیں گے۔ ضروری یہ تھا کہ مطالبات کی وضاحت کی جائے اور حکومت کو ہندوستانیوں کے احساسات سے باخبر کرایا جائے۔

''آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے''

1890 کی دہائی تک آتے آتے کانگریس کے سیاسی طرزِ عمل پر ہندوستانیوں نے سوال اٹھانے شروع کر دیے تھے۔ بنگال، مہاراشٹر اور پنجاب میں بپن چندر پال، بال گنگا دھر تلک اور لالہ لاجپت رائے جیسے رہنماؤں نے زیادہ انتہا پسندانہ مقاصد اور ذرائع کی تلاش شروع کر دی تھی۔ انھوں نے اعتدال پسندوں کی ''خوشامدانہ پالیسیوں'' پر تنقید شروع کی اور خود انحصاری نیز تعمیری کاموں کی اہمیت پر زور دیا۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ لوگوں کو حکومت کے ''نیک'' ارادوں پر نہیں بلکہ خود اپنی طاقت پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ لوگوں کو سوراج (اپنی حکومت) کے لیے جنگ کرنی چاہیے۔ تلک نے یہ نعرہ دیا کہ ''آزادی میرا پیدائشی حق ہے اور میں اسے حاصل کر کے رہوں گا۔''

1905 میں وائسرائے کرزن نے بنگال تقسیم کر دیا۔ اس وقت بنگال برطانوی ہندوستان کا سب سے بڑا صوبہ تھا اور اس میں بہار کے علاوہ اُڑیسہ کے کچھ حصے بھی شامل تھے۔ برطانوی حکومت کا کہنا تھا کہ یہ تقسیم انتظامی سہولتوں کی وجہ سے کی گئی ہے لیکن انتظامی سہولتوں سے کیا مراد تھی؟ اس سے کن لوگوں کو سہولت ملنے والی تھی؟ یہ بات تو بالکل عیاں تھی کہ اس تقسیم کا تعلق افسران اور تاجروں کے مفادات سے تھا۔ غیر بنگالی علاقوں کو صوبہ سے ہٹانے کے بجائے، حکومت نے مشرقی بنگال کو الگ کر کے اس کو آسام کے ساتھ ضم کر دیا۔ غالبًا برطانیہ کا مقصد یہ تھا کہ بنگالی سیاست دانوں کے اثرات کو کم کیا جائے اور بنگالی لوگوں کو تقسیم کر دیا جائے۔

بنگال کی تقسیم نے تمام ہندوستان کے لوگوں کو مشتعل کر دیا۔ کانگریس کے گروہوں نے — چاہے وہ انتہا پسند ہوں یا اعتدال پسند — اس تقسیم کی مخالفت کی۔ بڑے بڑے

ماخذ 2

سونے کے حصول کی خواہش

1887 میں ایک اعتدال پسند رہنما دن شا واچا (Dinshaw Wacha) نے نوروجی کو لکھا تھا:

> فیروز شاہ آج کل اپنے کسی ذاتی کام میں مصروف ہیں۔ وہ پہلے سے ہی کافی دولت مند ہیں ...... مسٹر تیلنگ بھی مصروف رہتے ہیں۔ اگر سب سونے کے لیے بھاگ دوڑ میں ایسے ہی مصروف رہے تو میں حیران ہوں کہ ملک کا کام کیسے آگے بڑھے گا؟

سرگرمی

اوپر دی گئی رائے کی روشنی میں کانگریس اپنے آغاز میں کن مسائل سے دوچار تھی؟

2019-20

شکل 3 – بال گنگا دھر تلک

میز پر جو اخبار پڑا ہے اس پر غور کیجیے یہ ایک مراٹھی اخبار ''کیسری'' ہے۔ جس کے مدیر تلک تھے جو برطانوی حکومت پر سخت تنقید کرنے والوں میں شامل تھے۔

عوامی جلسے اور مظاہرے ہوئے اور عوامی مظاہروں کے نئے نئے طریقے ایجاد ہوئے۔ اب جو جد و جہد شروع ہوئی اسے سودیشی تحریک کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ تحریک بنگال میں تو بہت شدید تھی ہی لیکن اس کی گونج ہر جگہ تھی مثلاً آندھرا کے ڈیلٹا تک یہ تحریک وندے ماترم تحریک کے نام سے مشہور ہوئی۔

سودیشی تحریک برطانوی حکومت کی مخالفت کرتی تھی اور اپنی مدد آپ۔ سودیشی صحت، قومی تعلیم اور ہندوستانی زبانوں کے استعمال پر زور دیتی تھی۔ سوراج حاصل کرنے کی اس لڑائی میں انتہا پسند یہ چاہتے تھے کہ اس میں بڑے پیمانے پر لوگ شرکت کریں۔ انھوں نے برطانوی اداروں اور برطانوی سامان کے بائیکاٹ کی بھی حمایت کی۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ برطانوی حکومت کا تختہ پلٹنے کے لیے **''انقلابی تشدد''** ضروری ہے۔

بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں کچھ اور اہم واقعات بھی رونما ہوئے۔ مسلمان زمینداروں اور نوابوں کے ایک گروپ نے 1906 کے اندر ڈھاکہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی۔ لیگ نے بنگال کی تقسیم کی حمایت کی۔ لیگ مسلمانوں کے لیے الگ انتخابی حلقے چاہتی تھی۔ اس مطالبے کو 1909 میں حکومت نے مان لیا۔ کونسلوں میں اب

شکل 4 – سودیشی تحریک کے دوران مظاہروں میں ہزاروں لوگ شریک ہوئے

کچھ سیٹیں ان مسلمانوں کے لیے مخصوص کر دی گئیں جنھیں مسلمان رائے دہندگان منتخب کرتے۔ اس سے سیاستدانوں کو یہ موقع ہاتھ آیا کہ اپنے مذہبی گروہوں کی تقسیم مذہبی بنیاد پر کر کے اپنے ماننے والوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔

اس دوران 1907 میں کانگریس میں دو گروہ بن گئے۔ اعتدال پسند بائیکاٹ کے مخالف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس سے طاقت کا استعمال بڑھے گا۔ اس گروہ بندی کے بعد کانگریس پر اعتدال پسندوں کا غلبہ ہو گیا جب کہ تلک کے ہمنوا باہر رہ کر کام کرتے رہے۔ 1915 میں دونوں گروپ ایک ہو گئے۔ اگلے سال کانگریس اور مسلم لیگ نے تاریخی لکھنؤ معاہدہ پر دستخط کیے اور ملک میں نمائندہ حکومت کے لیے ایک ساتھ کام کرنے کا فیصلہ کیا۔

شکل 5 – لالہ لاجپت رائے

پنجاب کے ایک قوم پرست اور اس انتہا پسند گروپ کے ممتاز رکن تھے جو خوشامدانہ سیاست کے سخت خلاف تھا۔ وہ آریہ سماج کے بھی ایک فعال رکن تھے۔

عوامی قوم پرستی کا ارتقا

1919 کے بعد برطانوی راج کے خلاف جو جدوجہد تھی وہ بتدریج ایک عوامی تحریک بن گئی جس میں کسان، قبائل، طلبا، بڑی تعداد میں عورتیں اور کبھی کبھی فیکٹری مزدور بھی شامل ہو گئے۔ 1920 کی دہائی میں تاجر طبقہ بھی کانگریس کی حمایت کرنے لگا تھا۔ ایسا کیوں ہوا؟

پہلی جنگ عظیم نے ہندوستان کی سیاسی اور اقتصادی صورت حال بدل دی تھی۔ اس جنگ کے نتیجہ میں حکومت ہند کا دفاعی خرچ بہت بڑھ گیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ حکومت نے انفرادی آمدنی اور تاجروں کے منافع پر ٹیکسوں میں اضافہ کر دیا۔ فوجی اخراجات اور فوجی رسد کی مانگ بڑھنے سے اشیا کی قیمتوں میں زبردست اضافہ ہو گیا اور نتیجتاً عام آدمی کی مشکلات بڑھ گئیں۔ اس کے برخلاف تجارتی گروہوں نے جنگ سے زبردست منافع کمایا۔ جیسا کہ آپ ساتویں باب میں پڑھ چکے ہیں کہ جنگ کے نتیجے میں صنعتی سامان (جوٹ کے تھیلے، کپڑا اور ریلوں کی پٹریاں) کی مانگ میں اضافہ ہو گیا اور بیرونی ملکوں سے ہندوستان میں درآمد کم ہو گئی۔ اس طرح جنگ کے دوران ہندوستانی صنعتوں کی توسیع ہوئی اور ہندوستانی صنعتی گروپ ترقی کے زیادہ مواقع کی مانگ کرنے لگے۔

جنگ کی وجہ سے برطانیہ کو اپنی فوج میں بھی توسیع کرنی پڑی۔ گاؤں کو مجبور کیا گیا کہ وہ ایک غیر ملکی مقصد کے لیے سپاہی مہیا کریں۔ بہت سے سپاہیوں کو جنگ کے لیے غیر ملکوں میں بھیجا گیا۔ جنگ کے بعد جو لوگ واپس آئے ان کی سمجھ میں یہ بات آ چکی تھی کہ سامراجی طاقتیں کس کس طرح ایشیا اور افریقہ کے لوگوں کا استحصال کر رہی ہیں۔ وہ یہ خواہش بھی ساتھ لائے کہ وہ ہندوستان میں نوآبادیاتی حکومت کی مخالفت کریں گے۔

انقلابی تشدد – سماج میں ایک انتہا پسندانہ تبدیلی لانے کے لیے تشدد کا استعمال

مجلس – ایک ایسی مقررہ یا منتخب تنظیم جو انتظامی یا مشاورتی کام انجام دیتی ہے یا جو نمائندگی کرتی ہے۔

سرگرمی

معلوم کیجیے کہ پہلی جنگ عظیم کن ملکوں کے درمیان لڑی گئی۔

مزید یہ کہ 1917 میں روس میں انقلاب آ گیا۔ کسانوں اور مزدوروں کی جدوجہد کے بارے میں خبریں اور سوشلزم کے نظریات وسیع پیمانے پر پھیل گئے۔ اس سے ہندوستانی قوم پرستوں کے جوش وخروش میں اضافہ ہوا۔

شکل 6 – نیٹل(Natal) کانگریس کے بانی، ڈربن، جنوبی افریقہ *1895*

مہاتما گاندھی نے 1895 میں دیگر ہندوستانیوں کے ساتھ مل کر نسلی امتیازات کا مقابلہ کرنے کے لیے نیٹل کانگریس کی بنیاد ڈالی تھی۔ کیا اس تصویر میں آپ گاندھی جی کو پہچان سکتے ہیں؟ گاندھی جی پچھلی قطار میں کھڑے ہیں۔ وہ کوٹ پہنے اور ٹائی باندھے ہوئے ہیں۔

مہاتما گاندھی کی آمد

انھیں حالات میں مہاتما گاندھی ایک عوامی رہنما کی حیثیت سے سامنے آئے۔ آپ کو معلوم ہے کہ گاندھی جی 1915 میں 46 سال کی عمر میں جنوبی افریقہ سے ہندوستان آئے۔ جنوبی افریقہ میں گاندھی جی نسلی پابندیوں کے خلاف عدم تشدد کے اصول پر مظاہروں کی قیادت کر چکے تھے اور بین الاقوامی طور پر ایک محترم رہنما کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ انھوں نے جنوبی افریقہ میں جو مہمیں چلائی تھیں ان کی وجہ سے ان کا رابطہ مختلف قسم کے ہندوستانیوں سے ہو چکا تھا جن میں ہندو، مسلمان، پارسی اور عیسائی؛ گجراتی، تمل اور شمالی کے ہندوستان کے لوگ؛ اعلیٰ طبقے کے تاجر، وکلا اور مزدور شامل تھے۔

ہندوستان واپس آنے کے بعد گاندھی جی نے پہلے سال تمام ملک کا دورہ کیا، لوگوں کو سمجھا اور ان کی ضرورتوں اور مجموعی حالت سے براہ راست واقفیت حاصل کی۔ ابتدا میں انھوں نے چمپارن، کھیڑا اور احمد آباد کی مقامی تحریکوں میں حصہ لیا۔ یہاں ان کا رابطہ راجندر پرشاد اور ولبھ بھائی پٹیل سے ہوا۔ احمد آباد میں انھوں نے 1918 میں مل مزدوروں کی ہڑتال کی کامیاب قیادت کی۔

آیئے 1919 اور 1922 کے درمیان چلائی گئیں بعض تحریکات کا تفصیلی ذکر کریں۔

2019-20

رولٹ ستیہ گرہ

1919 میں گاندھی جی نے رولٹ ایکٹ کے خلاف ستیہ گرہ شروع کیا۔ یہ ایکٹ ابھی تازہ تازہ پاس ہوا تھا۔ اس قانون کے تحت بنیادی حقوق جیسے تقریر و تحریر کی آزادی پر پابندی عائد کردی گئی تھی اور پولیس کے اختیارات کو بڑھا دیا گیا تھا۔ مہاتما گاندھی، محمد علی جناح اور دوسرے رہنماؤں نے یہ محسوس کیا کہ حکومت لوگوں کے بنیادی حقوق پر پابندی نہیں لگا سکتی۔ ان لوگوں نے اس قانون پر سخت تنقید کی اور اس کو شیطانی اور جابرانہ عمل بتایا۔ گاندھی جی نے ہندوستانیوں سے کہا کہ وہ 6 اپریل 1919 کو عدم تشدد کے ساتھ اس ایکٹ کی مخالفت کریں، اسے **''یوم توہین اور دعا''** کے طور پر منائیں اور ھڑتال کریں۔ تحریک کو ستیہ گرہ سبھاؤں سے شروع کیا گیا۔

اگر چہ رولٹ ستیہ گرہ زیادہ تر بڑے شہروں تک محدود تھا لیکن یہ برطانوی حکومت کے خلاف پہلی کل ہند جدوجہد بن گئی۔ اپریل 1919 میں ملک میں بہت سے مظاہرے اور ہڑتالیں ہوئیں جنھیں کچلنے کے لیے حکومت نے وحشیانہ طور طریقے اختیار کیے۔ جلیاں والا باغ کے ظلم و ستم جو بیساکھی کے دن (13 اپریل) امرتسر میں جنرل ڈائر نے ڈھائے وہ انھیں کا حصہ تھے جنھیں برطانوی حکومت نے تحریک کو دبانے کے لیے اختیار کیا تھا۔ جب اس قتل عام کا علم رابندر ناتھ ٹیگور کو ہوا تو انھوں نے اپنے **نائٹ ہڈ** (Knighthood) سے دست بردار ہو کر اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا۔

رولٹ ستیہ گرہ کے تمام شرکا کی یہی کوشش رہتی تھی کہ برطانوی راج کے خلاف لڑائی

سرگرمی

جلیاں والا باغ کے قتل عام کے بارے میں معلومات حاصل کیجیے۔ جلیاں والا باغ کیا ہے؟ وہاں کیا اور کیسے مظالم ڈھائے گئے؟

شکل 7 - وہ احاطہ جس میں جنرل ڈائر نے لوگوں کی بھیڑ پر گولیاں چلائیں
لوگ دیواروں پر گولیوں کے نشانات کی طرف اشارے کر رہے ہیں۔

نائٹ ہڈ - کسی غیر معمولی شخصی کامیابی یا عوامی خدمت کے لیے تاج برطانیہ کی طرف سے دیا جانے والا اعزاز

میں ہندو مسلم اتحاد باقی رہے۔ یہی مہاتما گاندھی کی بھی نصیحت تھی۔ وہ ہندوستان کو ہندوؤں، مسلمانوں اور دیگر مذاہب کے ان تمام لوگوں کا ملک مانتے تھے جو یہاں رہتے ہیں۔ ان کو اس بات سے بڑی دلچسپی تھی کہ ہندو اور مسلمان کسی بھی منصفانہ مقصد کے لیے ایک دوسرے کی مدد کریں۔

تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات

خلافت کا مسئلہ بھی ایک ایسا ہی معاملہ تھا۔ 1920 میں برطانیہ نے ترکی کے سلطان یا خلیفہ پر ایک سخت معاہدہ تھوپ دیا۔ جس طرح لوگ جلیاں والا باغ کے قتل عام پر غصے میں بھرے ہوئے تھے اسی طرح اس معاہدے سے بھی ناراض تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی دلچسپی یہ تھی کہ گزشتہ عثمانی سلطنت کی طرح تمام مسلم مقدس مقامات پر خلیفہ کا اختیار رہے۔ خلافت تحریک کے رہنما محمد علی اور شوکت علی اب ایک مکمل ترک موالات کی تحریک شروع کرنا چاہتے تھے۔ گاندھی جی نے ان کی اس مانگ کی حمایت کی اور انھوں نے کانگریس پر یہ زور ڈالا کہ وہ ''پنجاب کے مظالم'' (جلیاں والا قتل عام) اور خلافت کے معاملے میں ہوئے مظالم کے خلاف مہم چلائے اور سوراج کا مطالبہ کرے۔

1921 اور 1922 کے دوران تحریک ترک موالات نے بڑا زور پکڑا۔ ہزاروں طلبا نے سرکاری اسکولوں اور کالجوں کو چھوڑ دیا۔ بہت سے وکلا جیسے موتی لال نہرو، سی۔ آر۔ داس، سی۔ راج۔ گوپال آچاریہ اور آصف علی نے وکالت چھوڑ دی۔ برطانوی خطابات واپس کر دیے اور قانون ساز مجالس کا بائیکاٹ کیا۔ لوگوں نے غیر ملکی کپڑے کی ہولی جلائی۔ 1920 اور 1922 کے درمیان غیر ملکی کپڑے کی درآمد بہت کم ہوگئی۔ لیکن یہ سب کچھ برف کے تودے کی اوپری سطح کی طرح تھا جس کا زیادہ حصہ پانی میں چھپا ہوتا ہے۔ اب ملک کے بڑے حصے میں حالات ایک زبردست انقلاب کے لیے سازگار تھے۔

لوگوں کے اقدامات

بہت سے معاملات میں تو لوگوں نے عدم تشدد کے طریقے سے برطانوی حکومت کی مخالفت کی لیکن ایسے بھی معاملات پیش آئے کہ انھوں نے گاندھی جی کے نعرے کی اپنے انداز میں تشریح کی اور مظاہرے کیے جو گاندھی جی کے نظریات سے میل نہیں کھاتے تھے۔ بہر کیف صورت حال کچھ بھی ہو لوگوں نے اپنی تحریکات کو مقامی مسائل اور پریشانیوں سے جوڑ دیا۔ چند مثالیں دیکھیے:

ماخذ 3

اذیت کا ابدی اصول

اہنسا (عدم تشدد) سے گاندھی جی کا کیا مطلب تھا؟ اہنسا کس طرح اس جدوجہد کی بنیاد بن گئی؟ گاندھی جی نے کہا تھا:

> بدلے کی توقع کیے بغیر مسلسل اچھے کام کیے جانے سے عدم تشدد کا جنم ہوتا ہے...... یہ عدم تشدد کا سب سے قیمتی سبق ہے...... جنوبی افریقہ میں...... میں نے ناانصافی اور مظالم کو روکنے کے مقصد سے اذیت کے ابدی اصول کو بخوبی سمجھ لیا ہے اس کا واضح مفہوم ''عدم تشدد'' ہی ہے...... اس کے لیے آپ کو کسی بھی شخص کے ہاتھوں اذیت پانے کے لیے بخوشی تیار رہنا چاہیے اور آپ کسی کے لیے برا خیال نہیں رکھیں گے۔ یہاں تک کہ آپ کو اذیت پہنچانے والے کے لیے بھی نہیں۔

مہاتما گاندھی

12 مارچ 1938

گھیرا بندی - کسی عمارت یا دوکان وغیرہ کے باہر لوگوں کا مظاہرہ تا کہ کسی کو عمارت میں داخل نہ ہونے دیں

گجرات کے کھیڑا علاقے میں پاٹیدار کسانوں نے حکومت برطانیہ کے ذریعے لگائے گئے زیادہ لگان کے خلاف غیر تشدد آمیز مہم چلائیں۔ آندھرا کے ساحل اور تمل ناڈو کے اندرونی علاقوں میں شراب کی دوکانوں کی **گھیرابندی** (Picketed) کی گئی۔ آندھرا پردیش کے گنٹور ضلع میں قبائیلیوں اور غریب کسانوں نے بہت سی ''جنگلاتی ستیہ گرھیں'' چلائیں۔ کبھی کبھی انھوں نے اپنے مویشی فیس کی ادائیگی کے بغیر جنگلوں میں چھوڑ دیے۔ ان کے مظاہروں کی وجہ یہ تھی کہ نو آبادیاتی حکومت نے جنگلاتی وسائل کے استعمال پر مختلف پابندیاں لگا دی تھیں۔ لوگوں کو یقین تھا کہ گاندھی جی ان کے ٹیکسوں میں تخفیف اور جنگلاتی قوانین کا خاتمہ کرادیں گے۔ بہت سے گاؤں میں کسانوں نے سوراج کا اعلان کر دیا اور ان کو یقین ہو گیا کہ '' گاندھی راج'' قائم ہونے والا ہے۔

سندھ میں (جواب پاکستان میں ہے) مسلمان تاجروں اور کسانوں میں خلافت تحریک کا بڑا جوش وخروش تھا۔ بنگال میں بھی تحریک ترک موالات کے سلسلے میں جو ہم آہنگی پیدا ہوگئی تھی اس سے فرقہ وارانہ اتحاد قائم ہوا اور قومی تحریک کو قوت ملی۔

پنجاب میں سکھوں کی اکالی تحریک ان بدعنوان **مہنتوں** کو اپنے گرودواروں سے ہٹانا چاہتی تھی جنھیں برطانوی حکومت کی پشت پناہی حاصل تھی۔ یہ تحریک بھی تحریک ترکِ موالات سے بہت زیادہ ملتی جلتی تھی۔ آسام میں چائے باغات کے مزدور ''گاندھی جی مہاراج کی جے'' کے نعرے لگاتے اور اپنی مزدوری میں اضافے کی مانگ کرتے۔ انھوں نے انگریزوں کی ملکیت والے باغات میں کام کرنا چھوڑ دیا اور یہ اعلان کیا کہ وہ گاندھی جی کی خواہش پر ایسا کر رہے ہیں۔ ایک دلچسپ بات یہ ہوئی کہ اس دور میں اسامی زبان کے ویشنو بھکتی کے گیتوں میں کرشن جی کے بجائے '' گاندھی راجا'' کا نام لیا جانے لگا۔

مہنت – سکھ گردواروں کے مذہبی منتظمین

غیر قانونی بے دخلی – کرایہ کی زمین سے غیر قانونی طور پر زبردستی کرایہ داروں کو ہٹا دینا

عوام کا مہاتما

مندرجہ بالا بیانات کی روشنی میں صاف نظر آتا ہے کہ لوگ گاندھی جی کو مسیحا خیال کرنے لگے تھے۔ ایسا مسیحا جو دکھوں اور افلاس سے نجات دلانے میں ان کی مدد کر سکتا تھا۔ گاندھی جی مختلف طبقوں میں اتحاد قائم کرنا چاہتے تھے۔ وہ طبقاتی کشمکش کے مخالف تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ کسان یہ سمجھتے تھے کہ زمینداروں کے خلاف جنگ میں گاندھی جی ان کی حمایت کریں گے اور زرعی مزدوروں کو یہ یقین تھا کہ گاندھی جی ان کو زمین مہیا کرا دیں گے۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا کہ معمولی لوگ اپنی کامیابیوں کا سہرا گاندھی جی کے سر باندھ دیتے۔

شکل 8 – گاندھی جی کی ہردلعزیز شخصیت کی پیش کش

عوام کے ذہن میں گاندھی جی کی تصویر ایک دیوتا جیسی تھی۔ اس تصویر میں گاندھی جی کرشن جی کا رتھ چلا رہے ہیں اور انگریزوں کے خلاف جنگ میں دیگر رہنماؤں کی رہنمائی کررہے ہیں۔
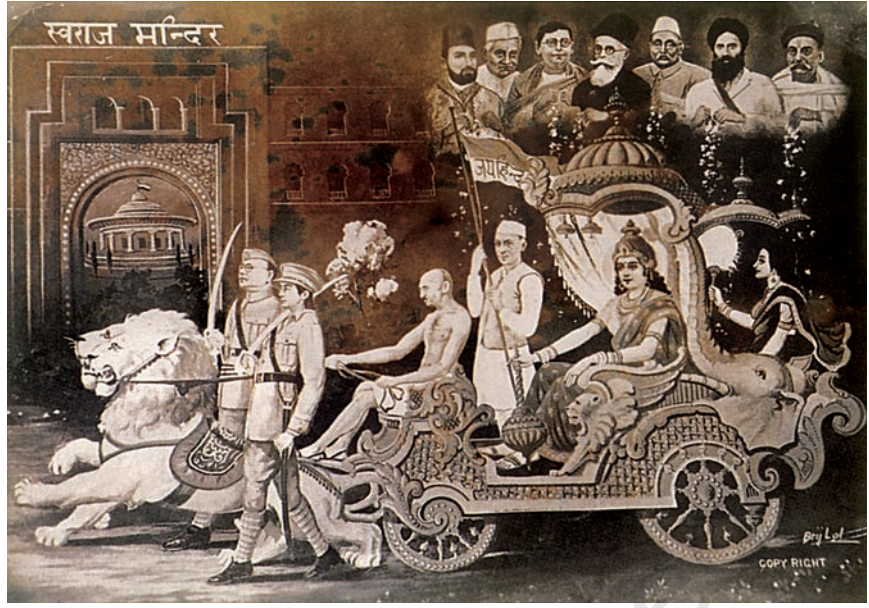
مثال کے طور پر ایک طاقتور تحریک کے خاتمہ پر صوبۂ متحدہ (موجودہ اتر پردیش) میں پرتاپ گڑھ کے کسان، کرایہ داروں کی **غیر قانونی بے دخلی** کو روکنے میں کامیاب ہو گئے تو انھوں نے یہ سمجھا کہ ان کی یہ مانگ گاندھی جی نے منوائی ہے۔ ایسا بھی ہوا کہ گاندھی جی کا نام استعمال کرکے قبائلیوں اور کسانوں نے ایسے اقدامات بھی کیے جو گاندھی جی کے اصولوں کے مطابق نہیں تھے۔

ماخذ 4

''پرتاپ گڑھ میں انھوں نے ہی بے دخلی کو رکوایا ہے''

نیچے سی آئی ڈی کی ایک رپورٹ کا اقتباس دیا گیا ہے۔ یہ رپورٹ الہ آباد ضلع کی ایک کسان تحریک کے بارے میں ہے، جنوری 1921:

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ مسٹر گاندھی کے نام کی شہرت دور دراز کے گاؤں میں بھی پھیل چکی ہے۔ بظاہر ایسا نہیں لگتا کہ کوئی یہ جانتا بھی ہے کہ وہ کون ہیں اور کیا ہیں۔ لیکن یہ بات مسلم ہے کہ جیسا وہ کہتے ہیں ویسا ہی ہوتا ہے اور وہ جو حکم دیتے ہیں اس پر عمل بھی ہوتا ہے۔ وہ ایک مہاتما یا سادھو ہیں، ایک پنڈت ہیں، ایک برہمن ہیں جو الہ آباد میں رہتے ہیں......... بلکہ وہ ایک دیوتا ہیں۔ ان کے نام کی طاقت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے پرتاپ گڑھ میں بے دخلی (غیر قانونی انخلا) کو رکوایا.......... اصولی طور پر گاندھی جی کو حکومت کا نہیں زمینداروں کا مخالف سمجھا جاتا ہے......... ہم گاندھی جی اور حکومت کے حق میں ہیں۔

سرگرمی

ماخذ 4 کو پڑھیے۔
اس رپورٹ کے مطابق مہاتما گاندھی کو لوگ کیسا خیال کرتے تھے؟ آپ کے خیال میں وہ یہ کیوں سمجھتے تھے کہ وہ زمینداروں کے مخالف تھے اور حکومت کے مخالف نہ تھے۔ آپ کیوں سمجھتے ہیں کہ وہ گاندھی جی کے حمایتی تھے۔

1922 - 1929 کے واقعات

جیسا کہ آپ کو علم ہے گاندھی جی پُر تشدد تحریک کے خلاف تھے۔ جب فروری 1922 میں چوری چورا کے پولیس اسٹیشن کو کسانوں کی ایک بھیڑ نے آگ لگا دی تو گاندھی جی نے تحریک ترک موالات کو فوراً واپس لے لیا۔ اس میں 22 پولیس والے مارے گئے تھے۔ پولیس نے چوں کہ کسانوں کے پُر امن مظاہرے پر فائرنگ کی تھی اس لیے لوگ مشتعل ہو گئے تھے اور انھوں نے پولیس اسٹیشن کو آگ لگا دی تھی۔

جب ترک موالات کی تحریک ختم ہو گئی تو گاندھی جی کے ماننے والوں نے یہ زور ڈالا کہ کانگریس دیہی علاقوں میں تعمیری کام شروع کرے۔ چترنجن داس اور موتی لال نہرو وغیرہ رہنماؤں نے یہ کہا کہ اب پارٹی کونسلوں کے انتخابات میں حصہ لے تاکہ حکومت کی پالیسیوں پر اثر انداز ہو سکے۔ 1920 کے وسط میں گاندھی وادیوں نے دیہی علاقوں میں پُر خلوص سماجی خدمات انجام دی تھیں جن کے نتیجے میں ایک ایسی اساس بن چکی تھی جہاں سے ان کو حمایت حاصل ہوتی۔ جب 1930 میں سول نافرمانی کی تحریک شروع ہوئی تو یہ چیز بہت سود مند ثابت ہوئی۔

شکل 9 – چترنجن داس

چترنجن داس تحریک آزادی کی ایک بڑی شخصیت اور مشرقی بنگال کے ایک وکیل تھے۔ وہ خاص طور پر تحریک ترک موالات میں بہت سرگرم رہے۔

شکل 10 - سائمن کمیشن کی مخالفت کرتے ہوئے مظاہرین

1927 میں انگلینڈ کی برطانوی حکومت نے ہندوستان کے سیاسی مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لیے لارڈ سائمن کی سرکردگی میں ایک کمیشن بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ کمیشن میں کوئی ہندوستانی نمائندہ نہیں تھا۔ ہندوستان میں اس فیصلے پر بڑا غصہ تھا۔ تمام سیاسی گروپوں نے کمیشن کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا۔ جب کمیشن ہندوستان پہنچا تو اس کا مظاہروں سے استقبال ہوا۔ مظاہرین کا نعرہ تھا ''سائمن واپس جاؤ۔''

ہندو تنظیم راشٹریہ سویم سیوک سنگھ (RSS) اور کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی تشکیل 1920 کی دہائی کے دو اہم واقعات تھے۔ ہندوستان کس طرح کا ملک ہونا چاہیے۔اس کے بارے میں ان دونوں پارٹیوں کے نظریات قطعاً مختلف تھے۔اپنے استاد کی مدد سے ان کے خیالات جاننے کی کوشش کیجیے۔انقلاب پسند قومی رہنما بھگت سنگھ بھی اس زمانے میں بہت سرگرم تھے۔

اس دہائی کے خاتمہ پر 1929 میں کانگریس نے جواہر لعل نہرو کی قیادت میں پورن سوراج (مکمل آزادی) کے حصول کی قرارداد پاس کی ساتھ ہی 26 جنوری 1930 کا دن تمام ملک میں یوم آزادی کے طور پر منایا گیا۔

> ''بہرے کانوں کو سنانے کے لیے دھماکے کی ضرورت ہوتی ہے۔
> ''انقلاب زندہ باد!''

انقلابی قومی رہنما جیسے بھگت سنگھ اور ان کے رفقا نوآبادیاتی حکومت اور استحصال پسند دولت مند طبقات کے خلاف لڑائی، مزدوروں اور کسانوں کے ذریعے لڑنا چاہتے تھے۔اس مقصد کے لیے انھوں نے 1928 میں دہلی کے فیروز شاہ کوٹلہ میں ہندوستان سوشلسٹ ریپبلیکن ایسوسی ایشن (HSRA) کی بنیاد ڈالی۔اس ایسوسی ایشن کے ممبران نے ایک پولیس آفیسر سانڈرس (Saunders) کو مار ڈالا جس نے اس لاٹھی چارج کی قیادت کی تھی جس میں لالہ لاجپت رائے کی موت ہوگئی تھی۔

اپنے ساتھی قومی رہنما بی۔ کے۔ دت کے ساتھ انھوں نے 18 اپریل 1929 کو مرکزی قانون ساز اسمبلی پر بم پھینکا۔جیسا کہ انھوں نے پرچے میں لکھا تھا ان کا مقصد مار ڈالنا نہیں تھا بلکہ بہروں کو سنانا اور بدیسی حکومت کو اس کے استحصال کا مزہ چکھانا تھا۔بھگت سنگھ پر مقدمہ چلا اور 23 سال کی عمر میں ان کو پھانسی دے دی گئی۔

شکل *11* – بھگت سنگھ

ڈانڈی مارچ

پورن سوراج یعنی مکمل آزادی خود بخود نہیں مل سکتی تھی۔اس کے لیے لڑنا ضروری تھا۔ 1930 میں گاندھی جی نے اعلان کیا کہ وہ نمک کا قانون توڑنے کے لیے ایک مارچ کی قیادت کریں گے۔اس قانون کے تحت نمک بنانے اور بیچنے پر ریاست کی اجارہ داری تھی۔مہاتما گاندھی اور دیگر قومی رہنماؤں نے یہ دلیل دی کہ نمک پر ٹیکس لگانا ایک مذموم عمل ہے کیوں کہ یہ تو ہمارے کھانے کا بہت اہم جزو ہے۔اس نمک مارچ نے آزادی کی عمومی خواہش کو ایک ایسی خصوصی ضرورت سے جوڑ دیا جس میں ہر شخص شریک تھا اور اس طرح اس تحریک کو امیر و غریب کی تفریق سے بچا لیا۔

گاندھی جی اور ان کے پیچھے چلنے والوں نے سابرمتی سے ساحلی شہر ڈانڈی تک 240 میل سے زیادہ کا مارچ کیا جہاں انھوں نے ساحل سمندر پر پائے جانے والے قدرتی نمک کو جمع کر کے اور سمندر کے پانی کو ابال کے نمک بنا کر حکومت کا قانون توڑا۔ اس ستیہ گرہ میں کسانوں، قبائلیوں اور عورتوں نے بڑی تعداد میں حصہ لیا۔ ایک تجارتی وفاق (Federation) نے نمک کے موضوع پر ایک پمفلیٹ شائع کیا۔ حکومت نے پر امن ستیہ گرہ کرنے والوں کے خلاف ظالمانہ کارروائی کے ذریعے اس تحریک کو کچلنے کی کوشش کی۔ ہزاروں لوگ جیل بھیج دیے گئے۔

1935 کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ نے **صوبوں کی خودمختاری** کی بات مان لی اور حکومت نے 1937 میں صوبہ جاتی قانون ساز اداروں کے لیے انتخابات کا اعلان کر دیا۔ اس طرح ہندوستانی لوگوں کی مشترکہ کوششیں بار آور ہوئیں۔

شکل 12 - قدرتی نمک کے ایک ڈلے کو اٹھا کر گاندھی جی نمک کا قانون توڑ رہے ہیں، ڈانڈی، 6 اپریل 1930

آزادی کی جدوجہد میں خواتین: کرناٹک کی امبابائی

قومی تحریک میں گوناگوں پس منظر رکھنے والی خواتین شریک ہوگئیں۔ جوان، بوڑھی، شادی شدہ، غیر شادی شدہ جن میں کچھ کا تعلق دیہی علاقوں سے تھا تو کچھ کا شہری علاقوں سے، کچھ قدامت پسند گھرانوں کی تھیں تو کچھ آزاد خیال خاندانوں سے۔ آزادی کی اس جدوجہد میں ان کی شرکت عورتوں کی تحریک کے لیے بھی اور ذاتی طور پر خود ان کے لیے بھی بہت اہم تھی۔

برطانوی اعلیٰ افسران اور ہندوستانی قوم پرستوں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ عورتوں کی شرکت سے اس قومی جدوجہد کو بہت تقویت ملی ہے۔ تحریک آزادی میں شرکت ان کو گھروں سے باہر لے آئی۔ اس سے مختلف پیشوں اور حکومت میں ان کو مقام ملا اور مردوں کے ساتھ برابری کی راہ ان کے لیے ہموار ہوئی۔

عورتوں کے لیے اس شرکت کا کیا مطلب تھا یہ انھی کی کہانی سے بہتر طور پر سمجھ میں آئے گا۔ کرناٹک کی امبابائی کی شادی بارہ سال کی عمر میں ہوگئی تھی۔ وہ سولہ سال کی عمر میں ہی بیوہ ہوگئیں اور انھوں نے اودپی میں غیر ملکی کپڑے اور شراب کی دوکانوں پر لوگوں کو جانے سے روکا۔ ان کو گرفتار کر لیا گیا۔ سزا پوری ہونے کے بعد ان کو دوبارہ گرفتار کر لیا گیا وہ جب جب جیل سے باہر آئیں سیاسی تقریریں کرتیں، لوگوں کو سوت کاتنا سکھاتیں اور پربھات پھیریوں کا اہتمام کرتیں تھیں۔ امبابائی ان دنوں کو اپنی زندگی کے سب سے خوشگوار دن سمجھتی تھیں کیوں کہ ان سے ان کو ایک نیا مقصد اور نئی ذمہ داری نباہنے کا احساس ملا۔

بہرحال اس تحریک میں شرکت کرنے کے حق کے لیے عورتوں کو ایک لڑائی لڑنی پڑی مثال کے طور پر نمک ستیہ گرہ کے دوران شروع میں خود مہاتما گاندھی بھی عورتوں کی شرکت کے مخالف تھے۔ سروجنی نائیڈو نے گاندھی جی کو آمادہ کیا کہ وہ اس تحریک میں شرکت کے لیے عورتوں کو اجازت دے دیں۔

2019-20

ستمبر 1939 میں یعنی صوبوں میں کانگریس کی دو سالہ حکومت کے بعد دوسری جنگ عظیم شروع ہوگئی۔ کانگریسی رہنماؤں نے ہٹلر کی مخالفت کرتے ہوئے برطانیہ کی جنگی کوششوں کی حمایت پر آمادگی ظاہر کی لیکن ساتھ ہی یہ مطالبہ بھی کیا کہ جنگ کے ختم ہونے کے بعد ہندوستان کو آزادی دی جائے۔ لیکن برطانیہ نے اس مطالبہ کو منظور نہ کیا۔ کانگریسی وزیروں نے احتجاجاً استعفے دے دیے۔

شکل 13 – سروجنی نائیڈو مہاتما گاندھی کے ساتھ، پیرس، *1931*

سروجنی نائیڈو 1920 کی دہائی کے اوائل سے قومی تحریک کی سرگرم کارکن رہیں۔ وہ ڈانڈی مارچ کی اہم رہنما تھیں۔ وہ ہندوستان کی پہلی خاتون تھیں جو انڈین نیشنل کانگریس کی صدر بنیں (1925)۔

ماخذ 5

ویرلکھن نائیک کو پھانسی دی گئی

نبرنگ پور کانگریس، اڑیسہ کے صدر باجی محمد 1930 کی دہائی میں رپورٹ لکھتے ہیں:

> 25 اگست 1942 کو...... نبرنگ پور کے پپرندی مقام پر پولیس فائرنگ کے نتیجے میں 19 آدمی موقع پر ہی مر گئے۔ بہت سے لوگ بعد میں زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسے۔ ایک ہزار سے زائد کو رایپٹ جیل بھیجے گئے۔ بہت سے لوگوں کو گولی ماردی گئی یا پھانسی دیدی گئی۔ ویرلکھن نائیک (ایک مشہور قبائلی رہنما جس نے برطانیہ کے سامنے سر خم نہ کیا) کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔

باجی نے لکھا ہے کہ نائیک اپنی پھانسی سے ذرا بھی پریشان نہ تھا۔ وہ صرف اس بات سے دکھی تھا کہ وہ صبح آزادی کو دیکھنے کے لیے زندہ نہ رہے گا۔

باجی محمد نے قومی جدوجہد میں شرکت کے لیے بیس ہزار لوگ اکٹھا کیے۔ اس نے بار بار ستیہ گرہ کیا۔ اس نے دوسری جنگ عظیم کے خلاف اور ہندوستان چھوڑو تحریک کی حمایت میں مظاہروں میں شرکت کی اور لمبی مدت جیل میں گزاری۔

''ہندوستان چھوڑو تحریک'' اور اس کے بعد

مہاتما گاندھی نے دوسری جنگ عظیم کے دوران برطانیہ کے خلاف تحریک کا ایک نیا مرحلہ شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ برطانیہ فوراً ہندوستان چھوڑ دے۔ انھوں نے برطانیہ کے خلاف اس جنگ میں ہندوستانیوں سے ''کرو یا مرو'' کا راستہ اختیار کرنے کو

صوبائی خود مختاری – ایک وفاق میں رہتے ہوئے صوبوں کو نسبتاً آزاد فیصلے لینے کی صلاحیت

شکل 14 – ہندوستان چھوڑو تحریک ، اگست 1942

مظاہرین ہر جگہ پولیس سے بھڑ گئے۔ ہزاروں لوگ گرفتار ہوئے۔ ایک ہزار سے زائد مارے گئے۔ بڑی تعداد میں لوگ زخمی ہوئے۔

کہا لیکن ساتھ ہی انھوں نے کہا کہ اس جنگ میں تشدد سے پرہیز ضروری ہے۔ گاندھی جی اور دیگر رہنماؤں کو فوراً ہی جیل بھیج دیا گیا لیکن تحریک پھیل گئی۔ تمام ملک میں ذرائع ترسیل اور ریاستی اقتدارِ اعلیٰ کی علامتوں پر حملے کیے گئے۔

سخت قسم کا جبر و تشدد برطانوی حکومت کا پہلا ردِ عمل تھا۔ 1943 کے ختم ہونے تک 90,000 لوگ گرفتار کیے گئے اور تقریباً 1000 لوگ پولیس فائرنگ میں مارے گئے۔ بہت سی جگہوں پر یہ حکم دیا گیا کہ ہوائی جہازوں سے بھیڑ پر مشین گن چلائی جائے۔ بہرحال باغیوں نے بالآخر ''حکومت'' کو جھکنے پر مجبور کر دیا۔

آزادی اور تقسیم

اسی دوران 1940 میں مسلم لیگ نے ایک قرارداد منظور کر کے ملک کے شمال مغربی اور مشرقی علاقوں میں مسلمانوں کے لیے ''آزاد ریاستیں'' بنانے کا مطالبہ کیا۔ اس قرارداد میں تقسیم یا پاکستان کا کوئی ذکر نہ تھا۔ لیگ نے برصغیر کے مسلمانوں کے لیے خودمختار حکومت کا کیوں مطالبہ کیا؟

1930 کی دہائی کے اواخر سے ہی لیگ نے مسلمانوں کو ہندوؤں سے الگ ایک ''قوم'' کی حیثیت سے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ 1920 اور 1930 کی دہائیوں میں کچھ ہندو اور مسلمان گروہوں کے درمیان تناؤ کی تاریخ نے شاید اس خیال کو پختہ کرنے میں اثر ڈالا ہو۔ ایسا لگتا ہے کہ 1937 کے انتخابات سے مسلم لیگ اس نتیجے پر پہونچی کہ مسلمان ایک اقلیت ہیں اور وہ کسی بھی جمہوری نظام میں ثانوی حیثیت میں ہی رہیں گے۔ اس کو یہ

بوس اور آئی این اے

شکل 15 – سبھاش چندر بوس

سبھاش چندر بوس ایک کٹّر قوم پرست رہنما تھے۔ ان کا جھکاؤ سوشلسٹ نظریات کی طرف تھا۔ وہ اگرچہ گاندھی جی کا احترام کرتے تھے اور ان کو ''بابائے قوم'' (راشٹر پتا) سمجھتے تھے لیکن وہ اہنسا کے نظریہ سے متفق نہ تھے۔ جنوری 1941 میں انھوں نے خفیہ طور پر اپنا کلکتے کا گھر چھوڑ دیا اور جرمنی کے راستے سنگاپور چلے گئے اور ہندوستان کو برطانیہ سے آزاد کرانے کے لیے آزاد ہند فوج (INA) بنائی۔ 1944 میں امپھال اور کوہیما کے راستے ہندوستان پر حملہ کرنے کی کوشش کی لیکن یہ مہم ناکام رہی۔ آزاد ہند فوج کے ممبران جیل بھیج دیے گئے۔ تمام ہندوستان کے لوگوں نے چاہے وہ کسی بھی شعبۂ زندگی سے تعلق رکھتے ہوں آزاد ہند فوج پر چلنے والے مقدمات کے خلاف تحریک میں حصہ لیا۔

شکل 16 – مولانا آزاد کانگریس ورکنگ کمیٹی کے دیگر ممبران کے ساتھ، سیوا گرام، *1942*

مولانا آزاد مکہ شہر میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد بنگال کے اور والدہ عرب کی رہنے والی تھیں۔ آزاد بہت سی زبانوں کے ماہر اور اسلام کے زبردست محقق تھے۔ مولانا وحدت ادیان کے بڑے حامی تھے۔ وہ گاندھی جی کی تحریکات میں شریک رہے۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کے بڑے طرفدار اور جناح کے دوقومی نظریے کے مخالف تھے۔

شکل 17 – گاندھی جناح مذاکرات سے پہلے چکرورتی راج گوپال آچاری گاندھی جی سے باتیں کرتے ہوئے، *1944*

راج گوپال آچاری جنوبی ہندوستان میں نمک ستیہ گرہ کے رہنما اور ایک جہاں دیدہ قوم پرست تھے۔ وہ راجہ جی کے نام سے مشہور تھے۔ وہ 1946 کی عبوری حکومت کے ایک ممبر اور آزاد ہندوستان کے پہلے ہندوستانی گورنر جنرل رہے۔
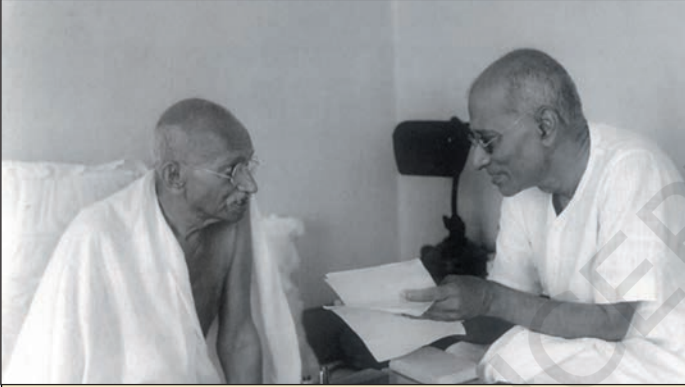
شکل 18 – *1945-47* کے دوران سردار ولبھ بھائی پٹیل نے آزادی کے لیے مذاکرات میں ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔

پٹیل گجرات میں نادیاڈ کے ایک غریب کسان گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ 1918 سے ہی وہ تحریک آزادی کے پیش رو رہنماؤں میں سے رہے اور 1931 میں کانگریس کے صدر بنے۔
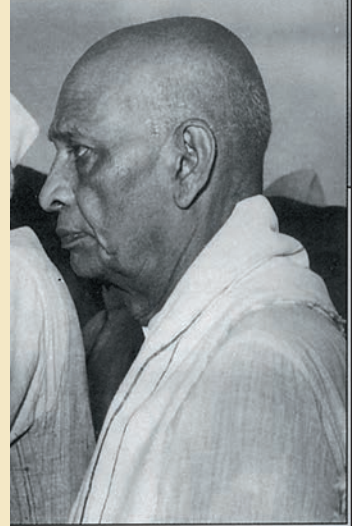
شکل 19 – مہاتما گاندھی کے ساتھ محمد علی جناح، بمبئی *1944*

جناح 1920 تک ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار رہے۔ لکھنؤ معاہدہ کی تشکیل میں انھوں نے اہم کردار ادا کیا۔ 1934 کے بعد انھوں نے مسلم لیگ کی از سر نو تنظیم کی اور مطالبۂ پاکستان کے سب سے اہم ترجمان بن گئے۔

شکل 20 - کانگریس کے بمبئی اجلاس ، سے پہلے جواہر لال نہرو مہاتما گاندھی کی بات سنتے ہوئے، جولائی *1946*

پنڈت نہرو گاندھی جی کے مقلد، کانگریسی سوشلسٹ ، قومی تحریک کے ممتاز رہنما اور آزاد ہندوستان کی سیاست و معیشت کے معمار تھے۔

''عام'' انتخابی حلقے - وہ انتخابی اضلاع جن میں کسی مذہبی یا دیگر فرقے کے لیے کوئی ریزرویشن نہ ہو۔

بھی خطرہ محسوس ہوا کہ ممکن ہے اس کو نمائندگی نہ مل پائے۔ 1937 میں صوبہ جات متحدہ میں کانگریس اور مسلم لیگ کی مشترکہ حکومت بنانے کی لیگ کی خواہش کو چوں کہ کانگریس نے مسترد کر دیا تھا اس لیے لیگ اس سے بھی دل برداشتہ تھی۔

1930 کی دہائی میں کانگریس مسلم رائے عامہ کو ہموار کرنے میں ناکام رہی۔ اس سے بھی لیگ کو اپنی سماجی مقبولیت کا دائرہ وسیع کرنے میں مدد ملی۔ 1940 کی دہائی کے ابتدائی سالوں میں جب زیادہ تر کانگریسی رہنما جیلوں میں تھے تو لیگ کو عوام کی حمایت حاصل کرنے کا موقع مل گیا۔ 1945 میں جنگ کے خاتمہ کے بعد برطانیہ نے ہندوستان کی آزادی کے لیے کانگریس اور لیگ کے ساتھ مذاکرات شروع کیے۔ یہ مذاکرات ناکام ہو گئے کیوں کہ لیگ خود کو مسلمانوں کا تنہا ترجمان سمجھتی تھی۔ کانگریس اس دعوے کو قبول نہیں کر سکتی تھی کیوں کہ بہت سے مسلمان اب بھی کانگریس کی حمایت کرتے تھے۔

1946 میں دوبارہ صوبائی الیکشن ہوئے۔ **''جنرل'' انتخابی حلقوں** میں کانگریس کی کارکردگی بہت اچھی رہی۔ لیکن مسلمانوں کے لیے مخصوص سیٹوں پر لیگ کی کامیابی بہت شاندار تھی۔ لیگ ''پاکستان'' کے لیے اپنے مطالبے پر جمی رہی۔ مارچ 1946 میں برطانوی کابینہ نے اس مطالبہ کا جائزہ لینے اور آزاد ہندوستان کے لیے ایک مناسب سیاسی سانچہ تجویز کرنے کے لیے ایک سہ نفری مشن دہلی بھیجا۔ اس مشن نے یہ تجویز کیا کہ ہندوستان متحد رہنا چاہیے اور ایک ایسا لچکدار وفاق بننا چاہیے جس میں مسلم اکثریت والے علاقوں کے لیے کچھ خود مختاری بھی ہو۔ لیکن اس تجویز کی تفصیلات پر کانگریس اور لیگ کے درمیان کوئی اتفاق رائے نہ بن سکا۔ اب تقسیم کم و بیش ناگزیر بن گئی۔

شکل *21* - شمال مغربی سرحد صوبہ کے پختون رہنما خان عبدالغفار خان ایک پر امن مارچ کے دوران اپنے ساتھیوں کے ساتھ بہار میں، مارچ *1947*

خان عبدالغفار خان جنھیں بادشاہ خان کے نام سے بھی جانا جاتا ہے خدائی خدمتگار تحریک کے بانی تھے۔ یہ ان کے صوبے کے پٹھانوں کی بڑی طاقتور اور عدم تشدد کی حامی تحریک تھی۔ بادشاہ خان تقسیم ہند کے سخت مخالفین میں سے تھے۔ 1947 میں تقسیم کی حمایت کے کانگریس کے فیصلے پر انھوں نے اپنے کانگریسی ساتھیوں پر سخت تنقید کی تھی۔
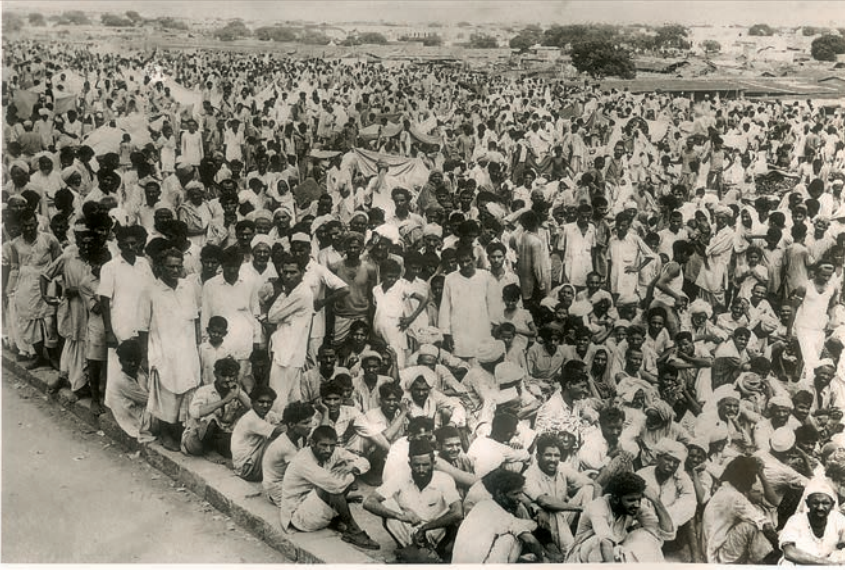
کیبنٹ مشن کے ناکام ہوجانے کے بعد لیگ نے اپنے پاکستان کے مطالبے کے حق میں عوامی تحریک چلانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے 16 اگست 1946 کو ''یوم راست اقدام'' (Direct Action Day) کے طور پر منانے کا فیصلہ کیا۔ اس دن کلکتے میں فسادات پھوٹ پڑے جو کئی دن چلے اور جن میں ہزاروں لوگوں کی جانیں گئیں۔ مارچ 1947 تک آتے آتے شمالی ہندوستان کے مختلف حصوں میں تشدد پھیل گیا۔

شکل 22 – فساد زدہ پنجاب کے پناہ گزیں نئی دلی میں، کھانے اور پناہ گاہ کی تلاش میں

تقسیم کے دوران ہزار ہا ہزار لوگ مارے گئے اور کتنی ہی عورتوں کو ناگفتہ بہ جور و تشدد کا سامنا کرنا پڑا۔ لاکھوں لوگوں کو اپنا وطن چھوڑ کے بھاگنا پڑا جو اجنبی سرزمین میں جا کر پناہ گزیں بن کے رہ گئے۔ تقسیم کا مطلب یہ بھی تھا کہ ہندوستان بدل گیا، اس کے بہت سے شہر بدل گئے اور ملک پاکستان وجود میں آ گیا۔ برطانوی راج سے ملک کی آزادی کی خوشی میں تقسیم کا درد اور اس کا تشدد بھی شامل ہو گیا۔

دوسری جگہوں پر

افریقہ میں قوم پرستی: گھانا کی صورت حال

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں بہت سے افرو ایشیائی ملکوں میں قوم پرستی کا عروج ہوا۔ ان میں سے اکثر ملکوں میں قوم پرستی آزادی کے لیے ایک نوآبادیات مخالف جدوجہد کی شکل میں ابھری۔ افریقہ میں نوآبادیاتی حکومت بہت آمرانہ تھی۔

غیر ملکی طاقتوں کے قائم مقام کے طور پر صرف ''سرداروں'' (Chiefs) کو حکومت کرنے کی اجازت تھی۔ اس کے علاوہ افریقیوں پر لاگو ہونے والے تمام قوانین سفید فاموں کی قانون ساز مجلسوں میں بنتے تھے۔ افریقیوں کو فیصلہ لینے کا کوئی اختیار نہ تھا اور نہ ہی اس معاملے میں دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ تک ان کو کوئی نمائندگی حاصل تھی۔ مقامی مالکان سے زمین چھین کر ان پر قبضے، بھاری بھرکم ٹیکس اور کام کاج کے لیے سخت نامناسب ماحول افریقیوں کے احتجاج کا باعث بنے۔

1957 میں صحرا کے خطے کا گھانا وہ پہلا افریقی ملک تھا جسے آزادی ملی۔ اس وقت تک گھانا گولڈ کوسٹ کہلاتا تھا۔ کوامے نکرومہ (Kwame Nkrumah) کی کنونشن پیپلز پارٹی نے ہڑتال، بائیکاٹ اور عوامی مظاہروں کے ذریعے تحریک آزادی کی قیادت کی تھی۔ 1951 میں اس پارٹی کو الیکشن میں زبردست فتح حاصل ہوئی۔ اس پارٹی نے اس نظام کی سخت مخالفت کی جس کے تحت برطانوی حکمرانوں نے سرداروں (Chiefs) کو قانون ساز اداروں میں نمائندے نامزد کرنے کا اختیار دے رکھا تھا۔ پارٹی نے برطانیہ پر زور ڈالا کہ ایسی مقنّنہ منظور کی جائے جس میں نہ نامزد ممبر ہوں اور نہ خصوصی ممبران۔ یہ مطالبہ 1954 میں منظور ہو گیا۔ نئی قانون ساز کونسل کے لیے 1956 میں انتخابات ہوئے۔ ان میں کنونشن پیپلز پارٹی کی جیت ہوئی اور ''گھانا'' کے نام سے ایک نئی آزاد مملکت کے اعلان کا راستہ صاف ہو گیا۔

تصور کیجیے!

تصور کیجیے کہ آپ قومی تحریک آزادی کے سرگرم رکن ہیں۔ اس باب کو پڑھنے کے بعد آپ جدوجہد کے لیے کون کون سے طریقے اختیار کرتے اور آپ کس طرح ہندوستان کو آزاد کراتے، مختصر طور پر بیان کیجیے۔

دوہرائیے

1۔ 1870 اور 1880 کی دہائیوں میں لوگ برطانوی راج سے کیوں غیر مطمئن تھے؟

2۔ انڈین نیشنل کانگریس کس کے لیے آواز اٹھانا چاہتی تھی؟

3۔ ہندوستان پر پہلی جنگ عظیم کے کیا اقتصادی اثرات پڑے؟

4۔ مسلم لیگ کی 1940 کی قرارداد میں کس چیز کا مطالبہ کیا گیا تھا؟

گفتگو کیجیے

4۔ مسلم لیگ کی 1940 کی قرارداد میں کس چیز کا مطالبہ کیا گیا تھا؟

5۔ اعتدال پسند کون تھے؟ انھوں نے برطانوی راج کے خلاف کس طرح کی جدوجہد کی تجویز کی؟

6۔ کانگریس کے انتہا پسندوں اور اعتدال پسندوں کی سیاست میں کیا فرق تھا؟

7۔ ہندوستان کے مختلف حصوں میں تحریک ترک موالات نے کیا کیا شکلیں اختیار کیں؟ لوگوں نے گاندھی جی کو کس طرح سمجھا؟

8۔ گاندھی جی نے نمک کے قانون کو توڑنے کی بات کیوں سوچی؟

9۔ 47-1937 کے دوران پیش آنے والے ان واقعات اور حالات پر بحث کیجیے جن کے نتیجے میں پاکستان وجود میں آیا۔

کر کے دیکھیے

10۔ پتہ لگائیے کہ آپ کے شہر، آپ کے ضلع، علاقے یا ریاست میں قومی تحریک کس طرح چلائی گئی۔ کس کس نے اس میں شرکت کی اور کس نے قیادت کی؟ آپ کے علاقے میں اس تحریک کو کیا کامیابی ملی؟

11۔ قومی تحریک کے دو رہنماؤں یا اس تحریک کے لیے دو اہم کام کرنے والوں کی حیات اور کارناموں کے بارے میں معلومات حاصل کیجیے اور ان کے بارے میں ایک مختصر مضمون لکھیے۔ آپ کسی ایسی شخصیت کا انتخاب بھی کر سکتے ہیں جن کا ذکر اس باب میں نہیں ہوا ہے۔

10 آزادی کے بعد ہندوستان

ایک نیا اور تقسیم شدہ ملک

اگست 1947 میں جب ہندوستان آزاد ہوا تو اسے کئی بہت بڑے چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑا۔ تقسیم کے نتیجے میں 80 لاکھ پناہ گزیں اُس علاقے سے جو آج پاکستان میں ہے ملک میں آ گئے۔ ان لوگوں کو گھر اور کام دونوں کی ضرورت تھی۔ دوسرا مسئلہ شاہی یا نوابی ریاستوں کا تھا۔ ایسی تقریباً 500 ریاستیں تھیں۔ ہر ایک پر کسی مہاراجہ یا نواب کی حکومت تھی۔ ان میں سے ہر ایک ریاست کو اس بات کی ترغیب دینی تھی کہ وہ نئے ملک کا حصہ بن جائے۔ پناہ گزینوں اور نوابی حکومتوں دونوں کے مسئلے کو فوری طور پر حل کرنا ضروری تھا۔ اب نئی قوم کو بڑے پیمانے پر ایک ایسا سیاسی نظام اختیار کرنا تھا جس میں تمام آبادی کی امیدیں اور توقعات بہتر طریقے پر پوری ہو سکیں۔

شکل 1 – مہاتما گاندھی کی راکھ(استھیاں) الہ آباد میں سپرد آب کی جارہی ہے، فروری *1948*

آزادی کو ابھی چھ ماہ بھی نہیں گزرے تھے کہ پوری قوم سوگ میں ڈوب گئی۔ 30 جنوری 1948 کو مہاتما گاندھی کو ایک بنیاد پرست جنونی ناتھورام گوڈسے نے اس لیے قتل کر دیا کہ وہ گاندھی جی کی اس بات سے متفق نہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ساتھ ساتھ اتحاد اور یگانگت سے رہنا چاہیے۔ اس شام کو سوگوار قوم نے جواہر لعل نہرو کا یہ رقت انگیز بیان آل انڈیا ریڈیو پر سنا ''دوستو اور ساتھیو! روشنی ہماری زندگی سے باہر نکل گئی اور اب ہر جگہ اندھیرا ہے .... ہمارے پیارے رہنما .... بابائے قوم اب ہمارے درمیان نہیں رہے۔''

سرگرمی

تصور کیجیے کہ آپ ایک برطانوی حاکم ہیں اور1947 میں ہندوستان چھوڑ کر جارہے ہیں۔آپ اپنے گھر ایک خط لکھتے ہیں اور اس میں یہ بتاتے ہیں کہ برطانوی لوگوں کے بغیر اب ہندوستان میں کیا پیش آسکتا ہے۔ ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں آپ کے خیالات کیا ہوں گے؟

1947 میں ہندوستان کی آبادی بہت زیادہ تھی۔تقریباً 34 کروڑ 50 لاکھ۔یہ آبادی بھی بٹی ہوئی تھی۔اعلیٰ ذاتوں اور نچلی ذاتوں کے درمیان تقسیم تھی، ہندو اکثریتی فرقوں اور ان ہندوستانیوں کے درمیان تقسیم تھی جو دیگر مذاہب کو مانتے تھے۔اس وسیع سرزمین کے شہری بہت سی مختلف زبانیں بولتے تھے، مختلف قسم کے لباس پہنتے تھے، مختلف قسم کے کھانے کھاتے تھے اور مختلف قسم کے ان کے پیشے تھے۔ یہ سب ایک قومی ریاست میں کس طرح ایک ساتھ رہ سکتے تھے؟

اتحاد کے ساتھ ساتھ ترقی کا مسئلہ بھی تھا۔آزادی کے وقت ہندوستان کی بہت بڑی آبادی گاؤں میں رہتی تھی۔کاشت کار اور کسان اپنی بقا کے لیے بارش پر منحصر رہتے تھے۔ نتیجتاً یہی معاملہ دیہی معیشت کے غیر رسمی سیکٹر کا تھا کیوں کہ اگر فصلیں خراب ہوجاتیں تو حجام، بڑھئی، بنکر اور دیگر خدمات انجام دینے والوں کو ان کی خدمات کا معاوضہ نہیں ملتا تھا۔شہروں میں فیکٹری مزدور گندی گھنی بستیوں میں رہتے تھے جہاں نہ تعلیم کی سہولت تھی اور نہ صحت کی۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ زراعتی پیداواریت بڑھا کر اور صنعتوں میں نوکریوں اور کام کے مواقع فراہم کرکے اپنے عوام سے افلاس کو ختم کرنا نئے ملک کی ذمہ داری تھی۔

اتحاد اور ترقی ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔اگر ہندوستان کے مختلف فرقوں کے درمیان تفریق اور تقسیم کی کھائی کو نہ پاٹا جاتا تو نتیجے میں تشدد آمیز جھگڑے شروع ہوتے جو قوم کو بہت مہنگے پڑتے —اونچی ذات کے لوگ نچلی ذاتوں سے لڑتے اور ہندو مسلمانوں سے— اور اس طرح یہ سلسلہ دراز ہوتا جاتا۔اسی کے ساتھ اگر اقتصادی ترقی کے فائدے عوام کو حاصل نہ ہوتے تو اس سے مزید تفریق و تقسیم پیدا ہوتی —مثال کے طور پر امیر اور غریب کے درمیان، شہروں اور گاؤوں کے درمیان، خوش حال اور پسماندہ علاقوں کے درمیان۔

آئین کی تشکیل

دسمبر1946 اور نومبر 1949 کے درمیان لگ بھگ تین سو ہندوستانیوں نے ملک کے سیاسی مستقبل کے بارے میں بہت سی نشستیں کیں۔اس آئین ساز اسمبلی کی نشستیں نئی دہلی میں ہوتی تھیں لیکن اس میں شرکت کرنے والے ملک بھر سے آتے اور ان کا تعلق ملک

کی مختلف سیاسی پارٹیوں سے ہوتا تھا۔ان لوگوں نے غور وفکر کر کے ہندوستان کے آئین کو تشکیل دیا جسے 26 جنوری 1950 کولاگو کر دیا گیا۔

شکل 2 – جواہر لعل نہرو اس قرار داد کو پیش کرتے ہوئے جس میں آئین کے مقاصد مذکور تھے

اس آئین کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ہر بالغ کے لیے **حق رائے دہی** (Franchise) کو تسلیم کیا گیا تھا۔ آئین کے مطابق 21 سال کی عمر کے تمام ہندوستانی لوگ ریاستی اور قومی انتخابات میں ووٹ دینے کے مجاز سمجھے گئے۔ امریکا اور برطانیہ جیسے ملکوں میں یہ حق مرحلہ وار تسلیم کیا گیا تھا۔ وہاں پہلے صرف صاحب جائداد لوگ ووٹ دیتے تھے پھر اس میں تعلیم یافتہ لوگوں کا بھی اضافہ ہو گیا۔ محنت کش لوگوں کو ووٹ دینے کا حق بڑی جدوجہد کے بعد ملا۔ سب سے آخر میں جب عورتوں نے سخت جدوجہد کی تو امریکا اور برطانیہ میں ان کو بھی ووٹ دینے کا حق حاصل ہوا۔ اس کے برخلاف آزادی ملنے کے فوراً بعد ہی ہندوستان نے جنس، طبقے یا تعلیم کی کسی تفریق کے بغیر اپنے تمام شہریوں کو ووٹ دینے کا حق دے دیا۔

حق رائے دہی۔ ووٹ دینے کا حق

آئین کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ اس نے اپنے تمام شہریوں کو قانون کی نظر میں مساوات کی ضمانت دی، چاہے ان کا تعلق کسی ذات یا کسی مذہب سے کیوں نہ ہو۔ کچھ

2019-20

ایسے بھی ہندوستانی تھے جو یہ چاہتے تھے کہ نئی قوم کا سیاسی نظام ہندو آدرشوں پر مبنی ہو اور ہندوستان ایک ہندو ریاست ہو۔ انھوں نے پاکستان کا حوالہ دیا جو اعلانیہ طور پر ایک مخصوص فرقے یعنی مسلمانوں کے مفادات کو فروغ دینے اور ان کا تحفظ کرنے کے لیے وجود میں آیا تھا۔ بہر حال، ہندوستانی وزیر اعظم جواہر لعل نہرو کی رائے یہ تھی کہ ہندوستان ایک ''ہندو پاکستان'' ہرگز نہیں ہونا چاہیے اور ایسا ہو بھی نہیں سکتا۔

مسلمانوں کے علاوہ ہندوستان میں سکھوں، عیسائیوں، پارسیوں اور جینیوں کی بھی بڑی آبادی تھی۔ اس نئے آئین کے تحت ان کو بھی وہی حقوق حاصل تھے جو ہندوؤں کو حاصل تھے، ان کو سرکاری اور پرائیویٹ سیکٹر میں نوکری یا کام کے وہی مواقع حاصل تھے جو ہندوؤں کو تھے اور قانون کی نظر میں سب کو یکساں حقوق حاصل تھے۔

اس دستور کی تیسری خصوصیت یہ تھی کہ اس نے غریب ترین اور محروم ترین ہندوستانیوں کو خصوصی مراعات عطا کیں۔ چھوا چھوت جو ''ہندوستان کے روشن نام'' پر ایک ''بدنما داغ'' تھی، کو ختم کر دیا گیا۔ پہلے مندروں میں صرف اعلیٰ ذاتوں کے لوگ جا سکتے تھے لیکن اب ان مندروں کے دروازے سب کے لیے کھول دیے گئے۔ اب ان میں سابق اچھوتوں کو بھی جانے کی اجازت ہو گئی۔ کافی طویل بحث و مباحثے کے بعد آئین ساز اسمبلی نے یہ بھی سفارش کی کہ قانون ساز مجلسوں کی کچھ سیٹیں اور ایسے ہی کچھ سرکاری نوکریاں ادنیٰ ذاتوں کے افراد کے لیے مخصوص کرا دی جائیں۔ کچھ لوگوں نے یہ کہا کہ اچھوت یا آج کی زبان میں ہریجن امیدوار باوقار انڈین ایڈمنسٹریٹو سروسز کے لیے ضروری مقام و مرتبے کے حامل نہیں ہیں۔ لیکن آئین ساز اسمبلی کے ایک ممبر ایچ۔ جے۔ کھانڈیکر (H.J. Khandekar) نے یہ جواب دیا کہ آج ہریجنوں کے ''ناموزوں'' ہونے کے ذمے دار اعلیٰ ذات والے لوگ ہی ہیں۔ کھانڈیکر نے اپنے صاحب مراعات ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہا تھا:

ہزاروں سال سے ہم کو دبائے رکھا گیا ہے۔ آپ نے اپنی اغراض کو پورا کرنے کے لیے ہم کو کام میں مشغول رکھا اور اس حد تک دبائے رکھا کہ نہ ہمارے ذہن کام کے رہے، نہ ہمارے جسم کام کے رہے اور نہ ہمارے دل کام کے رہے اور نہ ہم آگے بڑھنے کے قابل رہے۔

ماخذ 1

یہ ضروری ہے کہ ہم ان کو تحفظ اور حقوق دیں

نہرو نے ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ کے نام خط میں لکھا تھا:

......ہمارے ملک میں مسلمان اقلیت کی اتنی بڑی تعداد ہے کہ وہ اگر چاہیں بھی تو کہیں نہیں جا سکتے۔ یہ ایک ایسی بنیادی حقیقت ہے جس کے بارے میں کسی بحث کی گنجائش نہیں ہے۔ پاکستان کتنا ہی بھڑکائے اور وہاں کی غیر مسلم اقلیت کو کتنا بھی خوف زدہ کرے، ہمیں اس اقلیت کے ساتھ مہذب انداز میں ہی سلوک کرنا ہے۔ ہمیں ان کو تحفظ دینا ہے اور ان کو ایک جمہوری ریاست کے شہریوں جیسے حقوق دینے ہیں۔

سرگرمی

ایک مسلمان گھرانے کے باپ اور بیٹے کے درمیان ہونے والے مکالمے کا تصور کیجیے۔ تقسیم کے بعد بیٹا یہ سمجھتا ہے کہ پاکستان چلے جانا بہتر ہے جب کہ باپ کا یقین ہے کہ ان کو ہندوستان سے نہیں جانا چاہیے۔ اب تک جو باب آپ پڑھ چکے ہیں (اور باب 11) ان کی روشنی میں بتائیے کہ ہر ایک نے کیا کیا کہا ہوگا۔

سابقہ اچھوتوں کے ساتھ ساتھ آدی واسیوں یا درج فہرست قبائل (Scheduled Tribes) کے لیے بھی قانون ساز اداروں میں سیٹیں اور سرکاری نوکریاں مخصوص کردی گئیں۔ درج فہرست ذاتوں کی طرح یہ ہندوستانی بھی محروم رہے تھے اور ان کے ساتھ بھی امتیازی سلوک ہوا تھا۔ ان قبائل کو تعلیم اور صحت کی سہولیات سے بھی محروم رکھا گیا تھا اور ان کے جنگل اور زمینیں زیادہ طاقتور لوگ چھین لیتے تھے۔ ان حالات کو سدھارنے کے لیے دستور نے ان کو نئی مراعات عطا کیں۔

شکل 3 – ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبیڈ کر

ڈاکٹر امبیڈکر (1891-1956) کو احتراماً بابا صاحب کہا جاتا ہے۔ ان کا تعلق مراٹھی بولنے والے ایک دلت خاندان سے تھا۔ وہ ایک وکیل اور ماہر معاشیات تھے۔ ان کو دلتوں کا محترم رہنما اور بابائے آئین ہند کہا جاتا ہے

آئین ساز اسمبلی نے مرکزی حکومت اور ریاستی حکومتوں کے اختیارات اور حقوق پر کئی دن بحث کی۔ کچھ ارکان کا خیال تھا کہ مرکز کے مفادات اولیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ایک مضبوط مرکز ہی ''بحیثیت مجموعی پورے ملک کی فلاح و بہبود کے لیے سوچ بھی سکتا ہے اور پھر منصوبہ بندی بھی کرسکتا ہے۔'' دیگر ممبران کا خیال تھا کہ صوبوں کو زیادہ خودمختاری اور آزادی ملنی چاہیے۔ میسور کے ایک ممبر نے یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ موجودہ نظام کے تحت ''جمہوریت دہلی میں ہی مرکوز ہوکر رہ جائے گی اور اپنے جذبہ اور روح کے ساتھ باقی ملک میں کام نہ کرسکے گی۔'' مدراس کے ایک ممبر نے یہ اصرار کیا کہ ''صوبوں کے لوگوں کی فلاح و بہبود کی ذمہ داری صوبائی حکومتوں کی ہی ہونی چاہیے۔''

آئین نے ان تمام دعووں کو متوازن کرنے کے لیے جملہ اختیارات کی تین فہرستیں تیار کیں: ایک مرکزی فہرست، جس میں ٹیکسوں، دفاع اور امور خارجہ سے متعلق معاملات تھے۔ یہ مکمل طور پر مرکز کی ذمہ داری تھی۔ دوسری ریاستی فہرست جس میں تعلیم اور صحت وغیرہ کے امور تھے یہ خاص طور پر ریاستی حکومتوں کی ذمہ داری تھی۔ ایک تیسری مشترکہ فہرست تھی جس کے تحت جنگلات اور زراعت جیسے معاملات آتے تھے اور جو ریاست اور مرکز کی مشترکہ ذمہ داری تھی۔

آئین ساز اسمبلی میں ایک اہم موضوع زبان کا تھا، بہت سے ارکان کی یہ رائے تھی کہ انگریزوں کے ساتھ انگریزی کو بھی ہندوستان چھوڑنا چاہیے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ

2019-20

ہندی انگریزی کی جگہ لے۔ بہر حال جو لوگ ہندی نہیں بولتے تھے ان کی رائے اس سے مختلف تھی۔ اس اسمبلی میں بولتے ہوئے ٹی۔ ٹی۔ کرشنما چاری نے ''جنوب کے لوگوں کی طرف سے ایک دھمکی'' کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ کچھ لوگ یہ دھمکی دیتے ہیں کہ اگر ان پر ہندی مسلط کی گئی تو وہ ہندوستان سے الگ ہو جائیں گے۔ بہر حال اس مسئلہ پر ایک سمجھوتہ ہو گیا اور وہ یہ کہ ہندی ہندوستان کی ''سرکاری زبان'' ہوگی۔ عدالتوں میں، نوکریوں میں اور ریاستوں کے درمیان رسل ورسائل اور ابلاغ میں انگریزی استعمال ہوگی۔

اس آئین کی ترتیب و تشکیل میں بہت سے ہندوستانیوں نے تعاون دیا۔ لیکن سب سے اہم کردار ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبیڈکر نے ادا کیا۔ ڈرافٹنگ کمیٹی کے چیرمین تھے اور انھیں کی زیر نگرانی اس آئین کی دستاویز تیار ہوئی۔ آئین ساز اسمبلی کے سامنے اپنی آخری تقریر میں ڈاکٹر امبیڈکر نے کہا تھا کہ سیاسی جمہوریت کے ساتھ ساتھ اقتصادی اور سماجی جمہوریت بھی ضروری ہے۔ صرف حق رائے دہی دے دینے سے امیر و غریب اور اعلیٰ و ادنیٰ کے درمیان جو نابرابری ہے وہ خود بخود ختم نہیں ہو جائے گی۔ انھوں نے کہا کہ اس نئے آئین سے ہندوستان—

> تضادات کی ایک نئی دنیا میں داخل ہو رہا ہے۔ سیاست میں تو ہم کو برابری حاصل ہے لیکن سماجی اور اقتصادی زندگی میں ہم عدم مساوات کا شکار ہیں۔ سیاست میں ہم نے ایک شخص، ایک ووٹ اور ایک قدر کے اصول کو تسلیم کر لیا ہے۔ لیکن اپنی سماجی اور اقتصادی زندگی میں ہم اپنے سماجی اور اقتصادی ڈھرّے کی وجہ سے ایک شخص اور ایک قدر کے اصول کو قبول نہیں کرتے۔

ریاستوں کی تشکیل کس طرح ہوئی؟

آزادی سے قبل 1920 کی دہائی میں آزادی کی جدوجہد کی سب سے اہم پارٹی انڈین نیشنل کانگریس نے — یہ وعدہ کیا تھا کہ آزادی حاصل ہونے کے بعد ہر بڑے لسانی گروپ کو اس کا صوبہ ملے گا پھر آزادی ملنے کے بعد اس وعدے کو پورا کرنے کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔ مہاتما گاندھی کی کوششوں اور ان کی خواہشات کے برخلاف ہندوستان مذہب کی بنیاد پر تقسیم ہو گیا اور آزادی ایک ملک کو نہیں دو ملکوں کو ملی۔ ہندوستان کی تقسیم کے

سرگرمی

انگلش کو ہندوستان کی ایک زبان کے طور پر باقی رکھنے کے فیصلے پر آج اس کے ایک ایک فائدے اور نقصان کو اپنی کلاس میں بتائیے۔

لسانی (Linguistic) – زبان سے متعلق

نتیجے میں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان ہونے والے فسادات میں دس لاکھ سے زائد لوگ مارے گئے۔ کیا ملک زبان کی بنیاد پر مزید تقسیم کو برداشت کرسکتا تھا؟

وزیراعظم نہرو اور نائب وزیراعظم ولبھ بھائی پٹیل لسانی ریاستوں کو بنانے کے مخالف تھے۔ تقسیم کے بعد نہرو نے کہا تھا ''پھوٹ ڈالنے والی قوتیں آگے آگئی ہیں'' ان کو روکنے کے لیے پوری قوم کو مضبوط اور متحد ہونا ضروری ہے۔ پٹیل کا قول یہ تھا کہ:

> .... موجودہ وقت میں ہندوستان کی پہلی اور آخری ضرورت یہ ہے کہ وہ ایک قوم ہو .... ہر اس چیز کو فروغ دینے کی ضرورت ہے جس سے قوم پرستی کو بڑھاوا ملے اور ہر اس چیز کو مسترد کرنے کی ضرورت ہے جو قوم پرستی کی راہ میں رکاوٹ ہو۔ ہم نے لسانی صوبوں کے لیے بھی اسی اصول کو اپنایا ہے اور ہماری رائے میں اس معیار کے تحت لسانی صوبوں کی حمایت نہیں کی جاسکتی۔

شکل 4 – گاندھی وادی رہنما پوٹّی سری راملو، جن کا تیلگو بولنے والے لوگوں کے واسطے ایک الگ ریاست بنانے کے لیے برت کے دوران انتقال ہوا

چوں کہ کانگریسی رہنما اپنے وعدے سے ہٹ رہے تھے اس لیے ان کی اس بات سے بڑی ناامیدی پیدا ہوئی۔ کنڑ، مراٹھی اور ملیالم بولنے والوں کو امید تھی کہ ان کی اپنی الگ الگ ریاستیں ہوں گی۔ بہر حال مدراس پریزیڈینسی کے تیلگو بولنے والے اضلاع کی طرف سے سخت ترین احتجاج ہوا اور جب انتخابات کے دوران نہرو وہاں گئے تو ان کا کالی جھنڈیوں سے استقبال ہوا اور انھوں نے ''ہمیں آندھرا چاہیے'' کے نعرے سنے۔ اسی سال اکتوبر کے مہینے میں پرانے گاندھی وادی رہنما پوٹّی سری راملو نے بھوک ہڑتال کردی اور تیلگو بولنے والوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے آندھرا ریاست بنانے کا مطالبہ کیا۔ یہ برت چلتا رہا اور اس کو لوگوں کی بڑی حمایت ملی۔ بہت سے شہروں میں بند اور ہڑتالیں کی گئیں۔

15 دسمبر 1952 کو برت کی حالت میں 58 دن گزرنے کے بعد پوٹّی سری راملو کا انتقال ہوگیا۔ ایک اخبار نے لکھا تھا ''سری راملو کے انتقال کی خبر سے تمام آندھرا میں ایک افراتفری پیدا ہوگئی'' یہ احتجاج اتنے شدید تھے اور اتنی دور تک پھیل گئے تھے کہ مرکزی حکومت کو اس مطالبے کے آگے جھکنا پڑا۔ اس طرح یکم اکتوبر 1953 کو آندھرا پردیش کی نئی ریاست وجود میں آگئی۔

آندھراپردیش بننے کے بعد دوسرے فرقوں نے بھی اپنے لیے الگ ریاستوں کا مطالبہ کیا۔ نتیجتاً ایک ریاستی تنظیم نو کمیشن (State Reorganisation Commission) بنا دیا گیا جس نے 1956 میں اپنی رپورٹ سونپی اور اسامی، بنگالی، اُڑیہ، تمل، ملیالم، کنڑ اور تیلگو بولنے والوں کے واسطے مکمل صوبے تشکیل دینے کی غرض سے ضلعی اور صوبائی سرحدیں از سرِ نو متعین کرنے کی سفارش کی۔ شمالی ہندوستان کا ہندی بولنے والا خطہ بھی کئی ریاستوں میں بٹ گیا۔ کچھ ہی دنوں بعد 1960 میں بمبئی کی ذولسانی ریاست مراٹھی اور گجراتی بولنے والوں کے لیے جداگانہ ریاستوں میں تقسیم ہوگئی۔ 1966 میں ریاستِ پنجاب، پنجاب اور ہریانہ دو ریاستوں میں تقسیم ہوگئی۔ پنجاب پنجابی بولنے والوں کے لیے (جس میں اکثریت سکھوں کی تھی) اور ہریانہ باقی لوگوں کے لیے (جو ہریانوی یا ہندی بولتے تھے)۔

شکل 5 (a)
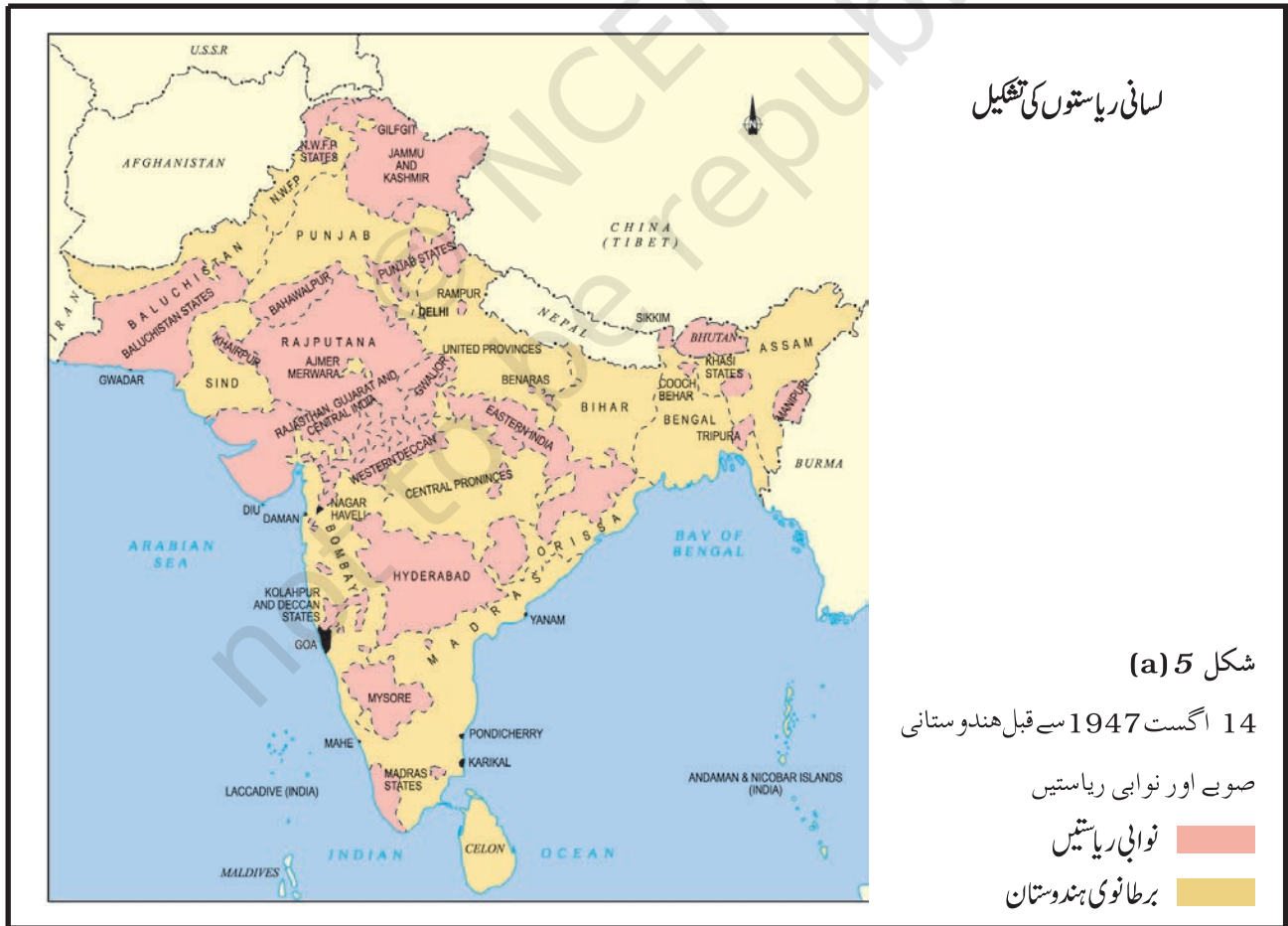
14 اگست 1947 سے قبل ہندوستانی صوبے اور نوابی ریاستیں

* ایسی ہر ایک ''نوابی ریاست'' کا اس وقت خاتمہ ہوگیا جب وہ ہندوستان یا پاکستان کے ساتھ الحاق پر راضی ہوگئی یا اس کو شکست ہوگئی۔ لیکن بہت سی ریاستیں 31 اکتوبر 1955 تک انتظامی اکائیوں کے طور پر کام کرتی رہیں۔ اس طرح سابقہ نوابی ریاستوں کی مدت 1948-1947 سے 31 اکتوبر 1955 تک رہی۔
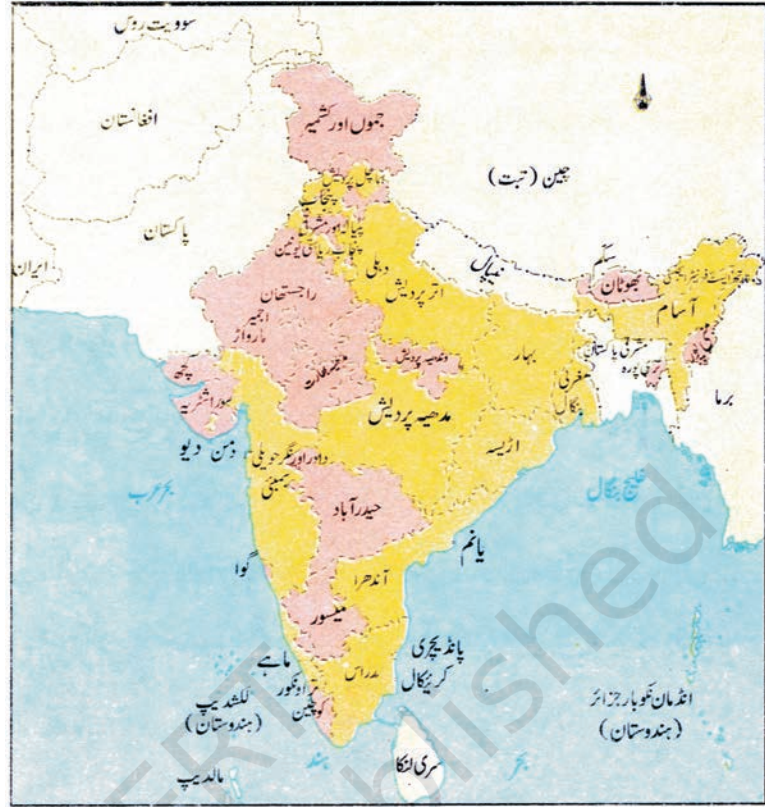
شکل 5(b) – 1 نومبر 1956 سے قبل ہندوستانی ریاستیں
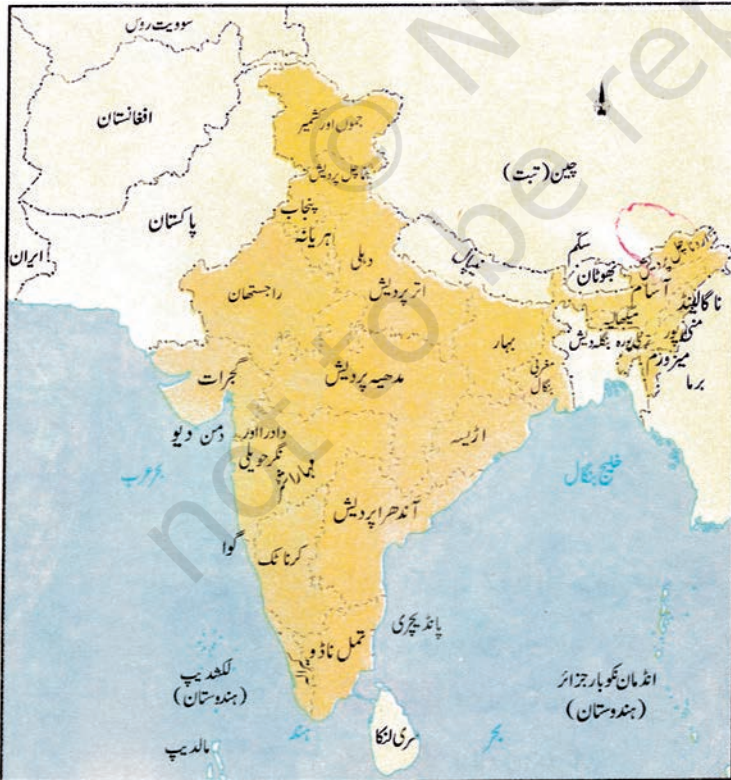
نقشہ 5(a)، 5(b) اور 5(c) کو دیکھیے۔ 5(b) میں نوابی ریاستیں غائب ہوگئیں۔ ان نئی ریاستوں کی نشاندہی کیجیے جو 1956 میں یا اس کے بعد بنیں اور ان ریاستوں کی زبان کی بھی نشاندہی کیجیے۔

شکل 5(c) – 1975 میں ہندوستانی
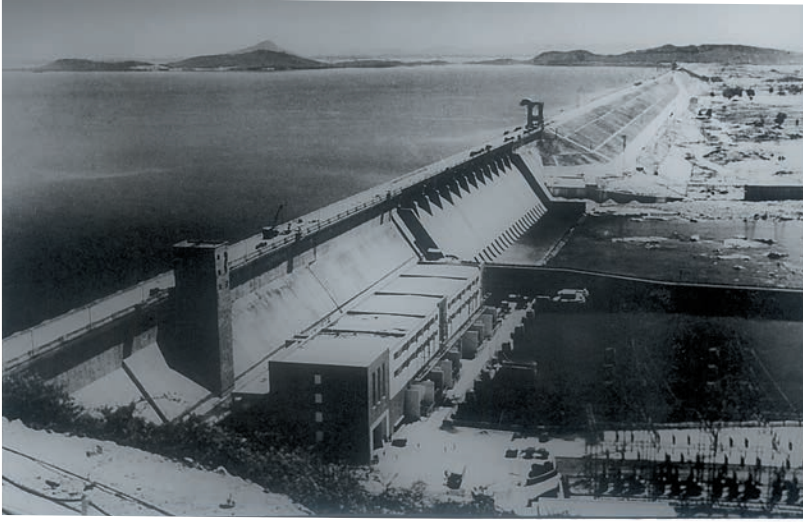
شکل 6 – پانی کا بہاؤ کنٹرول کرنے کے لیے مہاندی دریا پر پل
آزاد ہندوستان میں پل اور باندھ ترقی کی علامت بن گئے۔

ترقی کی منصوبہ بندی

اسٹیٹ (State) – یہ لفظ یہاں کسی ریاست یا صوبے کے لیے نہیں ہے بلکہ یہاں اس کا مفہوم حکومت یا سرکار ہے۔

ہندوستان اور ہندوستانیوں کو افلاس سے نجات دلانا اور ایک جدید تکنیکی اور صنعتی اساس کی تعمیر کرنا نئی قوم کے اہم مقاصد تھے۔ اقتصادی ترقی کے لیے منصوبے تیار کرنے اور مناسب پالیسیوں پر عمل کرنے کی غرض سے 1950 میں حکومت نے پلاننگ کمیشن کی تشکیل کی اور ایک ''مخلوط معیشت'' کے ماڈل پر اتفاق رائے ہوگیا۔ جس کے تحت **سرکاری** (State) اور پرائیوٹ سیکٹر دونوں کو ملازمتوں کے مواقع پیدا کرنے، اور پیداوار بڑھانے اور ایک دوسرے کے تعاون کا اہم کردار ادا کرنا تھا۔ یہ طے کرنا منصوبہ بندی کمیشن کا کام تھا کہ ان سیکٹروں کے الگ الگ اور خصوصی کردار کیا ہوں گے یعنی کون سی صنعتیں سرکاری سیکٹر قائم کرے گا اور کون سی صنعتیں بازار شروع کرے گا۔

1956 میں دوسرا پنج سالہ منصوبہ تیار کیا گیا۔ اس کا خاص زور اسٹیل جیسی بھاری صنعتوں کی ترقی اور بڑے بڑے باندھوں کی تعمیر پر تھا۔ یہ سیکٹر حکومت یا اسٹیٹ کے کنٹرول میں تھے۔ بھاری صنعتوں پر توجہ اور معیشت کی سرکاری ضابطہ بندی (State Regulation) کی کوششوں کا مقصد اگلی چند دہائیوں کے لیے اقتصادی پالیسیوں

شکل 7 – گاندھی ساگر باندھ پر کام جاری ھے
یہ ان چار میں سے پہلا باندھ ہے جو مدھیہ پردیش میں چمبل دریا پر بنائے گئے۔ یہ 1960 میں مکمل ہوا تھا۔

2019-20

ماخذ 2
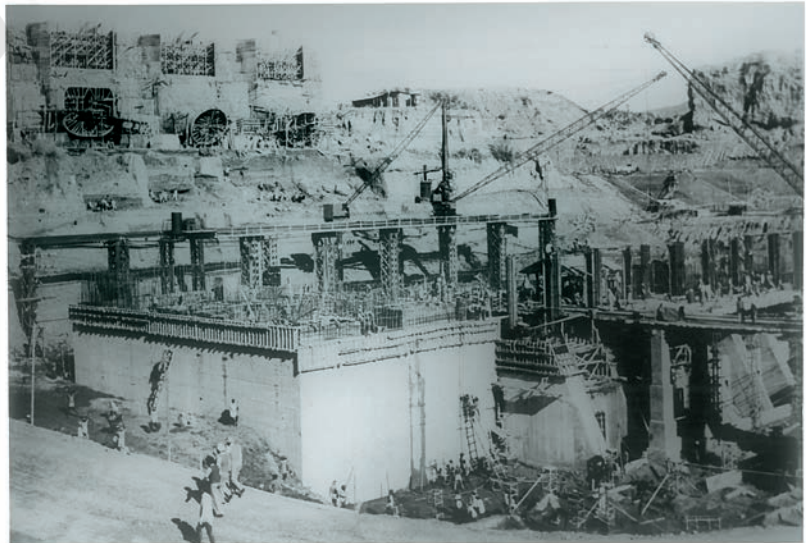
پنج سالہ منصوبوں پر نہرو کا نظریہ

سابق وزیر اعظم جواہر لعل نہرو اس منصوبہ بندی کے زبردست حامی تھے۔ انھوں نے مختلف ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ کے نام اپنے کچھ خطوط میں منصوبہ بندی کے مقاصد اور اس کے آدرشوں پر روشنی ڈالی ہے۔ 22 دسمبر 1952 کے ایک خط میں انھوں نے لکھا تھا:

..... پہلے پنج سالہ منصوبے کے پیچھے ہندوستان کی وحدت اور ہندوستان کے تمام لوگوں کی متحدہ اور پُر زور کوشش کا تصور کارفرما تھا..... ہمیں یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی ہے کہ سب کام حکومت کی مشینری ہی نہیں کرے گی بلکہ حکومت سے کہیں زیادہ کام لوگوں کا جوش وخروش اور تعاون کرے گا۔ ہمارے لوگوں میں کسی بھی کام کے لیے ساجھے داری کا احساس ہونا ضروری ہے، یہ احساس کہ ہم سب اپنے آئندہ مقاصد کے حصول کے لیے اور ایک ہی منزل پر پہنچنے کے لیے ایک ساتھ سفر کر رہے ہیں۔ یہ منصوبہ ماہرینِ شماریات اور ماہرینِ معاشیات کے اعداد وشمار اور حسابات پر مبنی ہے اور ایسا ہونا بھی چاہیے لیکن اعداد وشمار بے انتہا اہم ہونے کے باوجود اسکیموں کو زندگی نہیں دے سکتے۔ نئی زندگی تو کچھ دوسرے ہی راستے سے آتی ہے۔ اب ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ بے جان کاغذ پر تحریر اس منصوبے پر ہم اس طرح عمل کریں کہ وہ زندہ اور متحرک ہو اٹھے اور جو لوگوں کے تخیل اور توجہ کو اپنی جانب کھینچ لے۔

شکل 8 – جواہر لال نہرو بھلائی اسٹیل پلانٹ میں
بھلائی اسٹیل پلانٹ 1959 میں سابق سوویت یونین کی مدد سے شروع ہوا تھا۔ یہ چھتیس گڑھ کے پچھڑے دیہی علاقے میں واقع ہے۔ اسے آزادی کے بعد جدید ہندوستان کی ترقی کی ایک اہم علامت مانا جاتا ہے۔

کی رہنمائی کرنا تھا۔ اس طریقۂ کار کی بہت سے لوگوں نے حمایت کی لیکن کچھ ایسے بھی لوگ تھے جنھوں نے اس پر سخت تنقید کی۔ کچھ لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ زراعت پر ناکافی توجہ دی گئی ہے۔ کچھ ایسے بھی لوگ تھے جنھوں نے کہا کہ اس منصوبہ میں پرائمری ایجوکیشن کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ایسے بھی لوگ تھے جن کا خیال تھا کہ اقتصادی پالیسیوں کے ماحولیاتی مضمرات (Environmental Implications) پر دھیان نہیں دیا گیا ہے۔ ایک خاتون میرا بین نے جو مہاتما گاندھی کی پیرو تھیں، 1949 میں لکھا تھا: ''سائنس اور مشینری سے انسان وقتی طور پر بڑے بڑے فائدے حاصل کر سکتا ہے لیکن انجام کار اس سے تباہی ملے گی۔ ہمارے لیے فطرت کا مطالعہ ضروری ہے اور فطرت کے قوانین کی رعایت سے ہی ہمیں ترقی کرنی ہے۔ تبھی ہم ایک جسمانی طور پر تندرست اور اخلاقی طور پر صحت مند مخلوق کی حیثیت سے زندہ رہ سکتے ہیں۔''

سرگرمی

اپنی کلاس میں اس بات پر ایک مباحثہ کیجیے کہ کیا میرا بین کا یہ خیال درست ہے کہ سائنس اور مشینری بنی نوع انسان کے لیے مسائل پیدا کرے گی۔ صنعتی آلودگی اور جنگلات کی کٹائی کے دنیا پر جو اثرات مرتب ہوئے ہیں آپ ان کا ذکر کر سکتے ہیں۔

ایک آزاد خارجہ پالیسی کی تلاش

شکل 9 – جواہر لعل نہرو اور کرشنا مینن اقوام متحدہ میں داخل ہوتے ہوئے

کرشنا مینن نے 1962-1952 کے درمیان اقوام متحدہ میں ہندوستانی وفد کی قیادت کی تھی اور ناوابستہ کی تحریک کی حمایت کی تھی۔

دوسری جنگ عظیم کی لائی ہوئی تباہی اور بربادی کے فوراً بعد ہی ہندوستان کو آزادی ملی۔ اسی زمانے میں 1945 میں جو ایک نئی بین الاقوامی تنظیم — اقوام متحدہ — بنی تھی اس کی ابھی بہت کم عمر تھی۔ 1950 اور 1960 کی دہائیوں میں سرد جنگ کا آغاز ہوگیا۔ اس سرد جنگ کا مطلب تھا امریکہ اور سوویت روس کے درمیان طاقت کی رقابت۔ نظریاتی جنگ کے نتیجے میں دونوں ہی ملک اپنے اپنے فوجی اتحاد بنا رہے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نوآبادیاتی سلطنتیں ٹوٹ پھوٹ رہی تھیں اور بہت سے ممالک آزادی حاصل کر رہے تھے۔ وزیر اعظم جواہر لعل نہرو نئے آزاد ہندوستان کے وزیر خارجہ بھی تھے۔ انھوں نے اس سلسلے میں آزاد ہندوستان کی ایک خارجہ پالیسی ترتیب دی۔ اس خارجہ پالیسی کی بنیاد ناوابستگی تھی۔

شکل 10 – ایشیائی اور افریقی ملکوں کے رہنمائوں کی بانڈونگ (انڈونیشیا) میں ملاقات، *1955*

29 سے زیادہ نوآزاد ممالک نے اس مشہور کانفرنس میں شرکت کی اور اس بات پر غور و فکر کیا کہ کیا افریقی ایشیائی ملکوں کو نوآبادیات اور مغربی تسلط کی مخالفت جاری رکھنی چاہیے۔

ناوابستہ کی تحریک کے روحِ رواں مصر، یوگوسلاویہ، انڈونیشیا، گھانا اور ہندوستان کے رہنما تھے۔ انھوں نے مختلف ملکوں سے یہ درخواست کی کہ وہ دونوں میں سے کسی بھی اتحاد میں شریک نہ ہوں۔ لیکن ان اتحادوں سے دور رہنے کی پالیسی کا مطلب یہ نہیں تھا کہ بالکل الگ تھلگ اور بالکل غیر جانبدار رہا جائے۔ الگ تھلگ کا مطلب ہے دنیا میں ہونے والے تمام واقعات و معاملات سے الگ تھلگ، جب کہ ہندوستان جیسے ناوابستہ ملکوں نے امریکہ اور روسی اتحادوں کے درمیان ثالثی میں بہت سرگرم کردار نبھایا تھا۔ ان ناوابستہ ملکوں نے جنگ روکنے کی کوشش کی — اکثر جنگ کے خلاف ایک انسانی اور اخلاقی موقف اختیار کیا۔ بہرحال سب کچھ بھی رہا ہو، بہت سے ناوابستہ ملک خود ہندوستان بھی جنگ میں ملوث ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

1970 کی دہائی تک بہت سے ملک ناوابستہ ملکوں کی تحریک میں شامل ہو گئے تھے۔

ہندوستان، آزادی کے ساٹھ سال بعد

15 اگست 2007 کو ہندوستان نے اپنی آزادی کی ساٹھویں سالگرہ منائی۔ اس مدت میں ہمارے ملک نے کیا کیا ترقی کی اور آئین نے جو آدرش سامنے رکھے تھے وہ کہاں تک پورے ہوئے؟

ہندوستان آج بھی متحد اور جمہوری ہے۔ یہ ہمارے لیے کامیابی بھی ہے اور ہمارے لیے باعث فخر بھی۔ بہت سے غیر ملکی مبصرین کا یہ خیال تھا کہ ہندوستان ایک تنہا ملک کی حیثیت سے باقی نہیں رہے گا اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے کیوں کہ اس کا ہر خطہ اور ہر لسانی گروہ خود کو ایک الگ ملک بنانا چاہے گا۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال تھا کہ ہندوستان فوجی حکومت کے زیر اثر آ جائے گا۔ بہرحال آزادی کے بعد سے اب تک (2007 تک) 13 عام انتخابات ہو چکے ہیں۔ ریاستوں اور مقامی اداروں کے سیکڑوں انتخابات اس کے علاوہ ہیں۔ ملک کا پریس آزاد اور ملک کی عدلیہ بھی آزاد ہے۔ آخری بات یہ ہے کہ لوگ مختلف زبانیں بولتے ہیں اور مختلف مذہبوں کو مانتے ہیں لیکن یہ سب چیزیں قومی اتحاد کے راستے میں رکاوٹ نہیں ہیں۔

دوسری طرف گہری تفریقیں بھی موجود ہیں اور آئین کی ضمانت کے باوجود اچھوتوں یا آج کل کی زبان میں دلتوں کو تشدد اور بھید بھاؤ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ دیہی ہندوستان کے

اکثر حصوں میں ان لوگوں کو پانی کے ذرائع، مندر، پارک اور دیگر عوامی مقامات پر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ دستور کے عطا کردہ سیکولر آدرشوں کے باوجود بہت سی ریاستوں میں مختلف مذہبی گروہوں کے درمیان جھگڑے اور جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ امیر وغریب کے درمیان جو خلیج تھی وہ پچھلے سالوں میں بہت بڑھ گئی ہے۔ اقتصادی ترقی کا فائدہ ہندوستان کے کچھ حصوں اور کچھ لوگوں کو زیادہ پہنچا ہے۔ ان کے پاس رہنے کے لیے بڑے گھر ہیں اور یہ مہنگے ہوٹلوں میں کھانا کھاتے ہیں۔ ان کے بچے بہت مہنگے پرائیویٹ اسکولوں میں پڑھتے ہیں اور غیر ملکوں میں جاکر چھٹیاں مناتے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ بہت سے لوگ ہیں جو خط افلاس سے نیچے زندگی گذارتے ہیں، شہروں میں یہ گھنی اور گندی بستیوں میں رہتے ہیں یا پھر ایسے دور دراز گاؤوں میں رہتے ہیں جن میں بہت کم پیداوار ہوتی ہے۔ یہ لوگ اپنے بچوں کو اسکول تک نہیں بھیج پاتے۔

شکل 11 – بمبئی میں دھاراوی دنیا کی سب سے بڑی جُھگی بستی ہے
پس منظر میں فلک بوس عمارتیں ملاحظہ ہوں۔

آئین کے مطابق قانون کی نظر میں سب برابر ہیں لیکن حقیقی زندگی میں ایسا نہیں ہے۔ اگر ان معیاروں سے فیصلہ کیا جائے جو آئین نے آزادی کے بعد طے کیے تھے تو ہندوستانی جمہوریہ کسی بہت بڑی کامیابی کا دعویٰ نہیں کرسکتی۔ لیکن اس تجربے کو ناکامی کا نام بھی نہیں دیا جاسکتا۔

دوسرے مقام پر

سری لنکا میں کیا ہوا

1956 میں جس سال لسانی بنیاد پر ہندوستانی ریاستوں کی از سرِ نو تشکیل ہوئی اسی سال سری لنکا (اس وقت کا سیلون) کی پارلیمنٹ نے ایک قانون کے ذریعے سنہالا کو ملک کی تنہا سرکاری زبان کے طور پر تسلیم کرلیا۔ اس طرح سنہالا عدالتوں میں، پبلک امتحانات میں، تمام سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں ذریعہ تعلیم ہوگئی۔ ملک کی تمل زبان بولنے والوں نے جو اس جزیرے کے شمال میں رہتے تھے، اس قانون کی مخالفت کی۔ ایک تمل ممبر پارلیمنٹ نے کہا ''جب تم نے مجھ سے میری زبان چھین لی تو تم نے میری ہر چیز چھین لی''۔ ایک دوسرے ممبر پارلیمنٹ نے کہا ''تم ایک منقسم سیلون کی امید میں ہو۔ ڈرو نہیں، میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ تمھیں ایک تقسیم شدہ سیلون ضرور ملے گا''۔ ایک اپوزیشن کے ممبر نے جو خود بھی سنہالا بولتا تھا یہ پیشین گوئی کی تھی کہ اگر حکومت نے اپنا خیال نہیں بدلا اور قانون کو پاس کرانے کا اصرار کیا تو ایک چھوٹی سی ریاست سے دو چھوٹی خون آلود ریاستیں بھی ابھر سکتی ہیں''۔

شکل **12** – تمل جنگجو بندوق لے جاتے ہوئے
یہ سری لنکا میں خانہ جنگی کی ایک علامت ہے

کئی دہائیوں سے سری لنکا خانہ جنگی سے دو چار ہے۔ اس خانہ جنگی کی جڑیں تمل بولنے والی اقلیت پر سنہالا زبان کو تھوپنے میں پوشیدہ ہیں۔ ایک اور جنوبی ایشیائی ملک پاکستان اس وقت دو حصوں میں تقسیم ہو گیا جب مشرق کے بنگالی بولنے والوں نے محسوس کیا کہ ان کی زبان کو کچلا جا رہا ہے۔ اس کے برعکس ہندوستان ایک متحدہ ملک کی حیثیت سے اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے ہے کیوں کہ یہاں علاقائی زبانوں کو پھلنے پھولنے کی آزادی دی گئی ہے۔ جس طرح اردو کو مشرقی پاکستان میں یا سنہالا کو شمالی سری لنکا میں تھوپا گیا ہے ایسے ہی اگر ہندی کو جنوبی ہندوستان پر مسلط کر دیا جاتا تو ہندوستان میں بھی خانہ جنگی ہوتی اور ملک بکھر جاتا۔ جواہر لعل نہرو اور سردار پٹیل کے اندیشوں کے برخلاف، لسانی ریاستیں ہندوستان کے اتحاد کے لیے خطرہ نہیں ہیں بلکہ انھوں نے اس اتحاد کو مزید مستحکم کیا ہے۔ جب مختلف زبانوں کو اس خوف سے نجات مل گئی ہے کہ ان کو دبا دیا جائے گا تو مختلف لسانی گروہ مطمئن ہو کر وسیع تر ہندوستان میں یک جہتی کے ساتھ رہنے لگے ہیں۔

دوہرائیے

1۔ ان تین مشکلات کو بتائیے جن کا سامنا نو آزاد ہندوستان کو کرنا پڑا۔

2۔ منصوبہ بندی کمیشن کا کیا رول تھا؟

3۔ خالی جگہوں کو پُر کیجیے:

(a) ________ اور ________ موضوعات مرکزی حکومت کی فہرست میں شامل تھے۔

(b) ________ اور ________ موضوعات مشترکہ فہرست میں شامل تھے۔

(c) اقتصادی منصوبہ بندی جس کی رو سے سرکاری سیکٹر اور پرائیویٹ سیکٹر دونوں نے ترقی میں ایک کردار ادا کیا، اسے ________، ________ ماڈل کہا جاتا ہے۔

(d) ________ کی موت نے ایسے تشدد آمیز احتجاج بھڑکا دیے کہ حکومت کو آندھرا کی لسانی ریاست کے مطالبے کے آگے جھکنا پڑ گیا۔

تصور کیجیے

آپ ایک آدی واسی اور ایک ایسے شخص کے درمیان ہونے والی گفتگو کے شاہد ہیں جو سیٹوں اور نوکریوں میں ریزرویشن کے خلاف ہے۔ موافقت اور مخالفت میں جو دلائل دیے گئے ہوں گے وہ کیا ہو سکتے ہیں؟ ان کے درمیان ہونے والے مکالمے کو اداکاری کے ذریعے دکھائیے۔

4۔ درج ذیل بیانات صحیح ہیں یا غلط:

(a) آزادی کے وقت ہندوستانیوں کی اکثریت دیہات میں رہتی تھی۔

(b) آئین ساز اسمبلی کی تشکیل کانگریس پارٹی کے ممبران سے ہوئی تھی۔

(c) پہلے قومی انتخابات میں صرف مردوں کو ووٹ دینے کی اجازت تھی۔

(d) دوسرے پنج سالہ منصوبے کا مرکزی نقطہ بھاری صنعت کی ترقی تھا۔

گفتگو کیجیے

5۔ مندرجہ ذیل بیان سے ڈاکٹر امبیڈکر کا کیا مطلب تھا؟

''سیاست میں ہم برابر ہوں گے اور سماجی واقتصادی زندگی میں ہم نابرابر ہوں گے؟''

6۔ آزادی کے بعد ملک کو لسانی خطوط پر تقسیم کے معاملے میں تذبذب کیوں تھا؟

7۔ کوئی ایک وجہ بتائیے کہ آزادی کے بعد انگریزی ہندوستان میں کیوں رائج رہی؟

8۔ آزادی کے بعد ابتدائی دہائیوں میں ہندوستان کی اقتصادی ترقی کا کیا تصور تھا؟

کر کے دیکھیے

9۔ میرا بین کون تھیں؟ ان کی حیات اور نظریات کے بارے میں مزید معلومات حاصل کیجیے۔

10۔ پاکستان میں لسانی تقسیم کے بارے میں مزید معلومات حاصل کیجیے اور بتائیے کہ بنگلہ دیش نامی نیا ملک کن حالات میں وجود میں آیا اور بنگلہ دیش نے پاکستان سے کس طرح آزادی حاصل کی؟

اشکال اور نقشوں کے لیے اظہار تشکر

ادارے

دی القاضی فاؤنڈیشن فار دی آرٹس (باب 5،شکل 11)

دی اوشن آرکائیوا اینڈ لائبریری کلیکشن، ممبئی (باب 6، اشکال 1، 8)

نہرو میموریل میوزیم اینڈ لائبریری، نئی دہلی (باب 8، اشکال 4، 5، 7، 13؛ باب 10، اشکال 1، 2، 4، 6، 7، 9)

فوٹو ڈویژن، حکومت ہند، نئی دہلی (باب 7، شکل 20؛ باب 10، اشکال 3، 10)

رسائل

دی السٹریٹڈ لندن نیوز (باب 8، شکل 15)

کتب

امن ناتھ اور جے وِٹھالنی، ہوریزنس: دی ٹاٹا انڈیا سینچری، *1904-2004* (باب 6، اشکال 10، 14، 15)

سی۔اے۔ بیلی (مرتب)، این السٹریٹڈ ہسٹری آف ماڈرن انڈیا *1947 - 1600*

(باب 6، شکل 11؛ باب 7، اشکال 2، 4، 6؛ باب 10، اشکال 6، 7، 17، 22؛ باب 9، اشکال 3، 4، 5، 10)

جان بریمن، لیبر بانڈیج اِن ویسٹرن انڈیا (باب 8، شکل 11)

جیوتندر جین اور آرتی اگروال، نیشنل ہینڈیکرافٹس اینڈ ہینڈ لوم میوزیم، نئی دہلی، ماپن (باب 6، اشکال 4، 5)

مالویکا کرلیکر، ری ویزننگ دی پاسٹ (باب 8، اشکال 6، 8؛ باب 7، شکل 11)

مرینا کارٹر، سرونٹس، سردارس اور سیٹلرس (باب 8، شکل 9)

پیٹر روہے، گاندھی (باب 9، اشکال 1، 6، 12، 13، 14، 16، 17، 18، 19، 21)

سوسان ایس۔ بین، یانکی انڈیا: امریکن کامرشیل اینڈ کلچرل اِنکاؤنٹرس ود انڈیا اِن دی ایج آف سیل، *1784-1860* (باب 8، اشکال 3، 7)

یو۔ بال، جنگل لائف اِن انڈیا (باب 6، شکل 12)

ویریر ایلون، دی ایگیریا (باب 6، شکل 13)

ٹیکسٹائلس فار ٹیمپل ٹریڈ اینڈ ڈاؤری، کلیکشن سنسکرتی میوزم آف ایوری ڈے آرٹ (باب 6، اشکال 2، 6)